دشتِ وحشت
ذوالفقار نقوی

دشتِ وحشت

(تیسرا شعری مجموعہ)

برادرِ عزیز
سلیم سالک کی محبتوں کی نذر
ذوالفقار
18/5/22

شاعر
ذوالفقار نقوی

لے چلو چراغوں کو کر کے خون سے روشن
دشت کی سیاہی نے ہم کو بھی پکارا ہے

ہم فقیروں کو زمانے کی تب و تاب سے کیا
ہم جہاں بیٹھ گئے اپنی بنا لی دنیا

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

DASHT-E-WAHSHAT

(Poetry)

By: Syed Zulfiqar Ali shah

(Zulfiqar Naqvi)

Year of Edition 2021
ISBN: 978-93-91238-92-6
Price: Rs. 300/-

نام کتاب : دشتِ وحشت
شاعر : سید ذوالفقار علی شاہ
سکونت : نزد عسکری امام بارگاہ مہنڈر، ضلع پونچھ
جموں وکشمیر، بھارت۔ PIN-185111
پیشہ : معلم شعبہ انگریزی، محکمہ تعلیم، جموں وکشمیر
موبائل نمبر : 9797580748
ای میل : zulfiqar.naqvi72@gmail.com
سنِ اشاعت : ۲۰۲۱
تعداد : ۳۰۰
قیمت : ۳۰۰ روپے
پروف ریڈنگ : سید ناطق حسین جعفری، سید سجاد حسین نقوی
تخلیقات : زادِ سفر (2012) عباس بک ایجنسی، لکھنؤ
اُجالوں کا سفر (2013) اُردو فاؤنڈیشن، ممبئی
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678286, 45678204, 23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

میرے والدین

میری شریکِ حیات : سیدہ ذکیہ فاطمہ

اور میرے بچوں :

: سید منان حیدر

: سیدہ فرح نقوی

: سید خرم نقوی

------ کے نام

○○

فہرست

OO

حقانی القاسمی
نئی دہلی

انسانی ذہن میں خیالات کا خزانۂ عامرہ ہے۔ ان میں سے کچھ ہی خیالات کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔ باقی خیالات ذہن کے مردہ خانے میں محفوظ رہتے ہیں یا معدوم ہو جاتے ہیں۔

ذہن میں موجزن خیالات کی فنکارانہ ترسیل آسان عمل نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فنکار کی اظہاری اور تخیلی قوت سے ہی خیالات کی شکل اور صورت کے مدارج طے ہوتے ہیں۔ ایک پختہ فنکار معمولی یا عمومی خیالات کو بھی اپنے احساس و اظہار کی توانائی سے اتنا تابندہ کر دیتا ہے کہ شعری اظہاریے میں ایک نئی کیفیت سی پیدا ہو جاتی ہے۔

ذوالفقار نقوی نے اپنے تخلیقی اظہار میں فکری نبوغت اور لسانی قدرت و ندرت کا پورا ثبوت دیا ہے۔ ان کی لفظیات اور تراکیب میں تازہ کاری اور تنوع ہے۔ صحرا، دریا، اشک، آگ، سرِ دشتِ جنوں، وفورِ وحشتِ صحرا، اور دیگر تضادی تراکیب و لفظیات نے ان کی شعری رہ گزر کو اوروں سے الگ کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں طنزیاتی عناصر نے بھی ایک کشش کی کیفیت خلق کی ہے:

خشک روٹی تو دے نہیں سکتے
تر نوالوں کی بات کرتے ہو
تمھارے شہر میں کشکول خالی
یہاں اتنی گرانی ہو گئی ہے؟

نقوی کی شاعری انسانی معاملات و متعلقات، معاشرتی رویوں اور زوال پذیر ثقافتی

اقدار کا پُر اثر بیانیہ ہے۔ داخلی اور خارجی ادراکات کی عمدہ عکاسی ہے۔ عصری حسیت سے معمور ان کی شاعری میں لفظوں سے ماورا بھی بہت کچھ ہے۔ ان کے شعروں سے حیات و کائنات کی تفہیم کے عصری زاویے سامنے آتے ہیں اور احساس و اظہار کا ایک نیا درسا کھلتا محسوس ہوتا ہے۔

نقوی کا جداگانہ شعری اسلوب ہے۔ ایک الگ رنگ و آہنگ ہے۔ ان کا اپنا الگ لہجہ ہے جو ان کے تخلیقی جنون و ریاضت کا مظہر ہے۔ انہی کا ایک مصرع ہے: مرا جنون ہواؤں پہ چل بھی سکتا ہے۔

نقوی کا الگ طور و طرز ہے۔ بطور ثبوت یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مرے لبوں پہ جمی برف سوچ کر چھونا
تمھارے جسم کا آہن پگھل بھی سکتا ہے
یہ تیرہ شبی راستہ دے گی نہ کسی طور
سورج کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی پڑے گا

اس نوع کے بہت سے شعر ان کی تخلیقی زنبیل میں ہیں۔ جوان کے شعری انفراد اور اختصاص کا اشاریہ ہیں۔ ان کے ہاں لفظیات و تراکیب کے ساتھ تخیلات اور تصورات کی اعلیٰ سطح بھی ہے جو انھیں معاصر شاعروں میں مختلف پہچان عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

حقانی القاسمی، نئی دہلی

21/جون/2021

OO

پروفیسر شہپر رسول

نئی دہلی

ذوالفقار نقوی آج کے بہت سے شعرأ کی طرح لفظی شعبدہ بازی، چونکانے کی غیر ضروری کوشش اور اظہار کے مصنوعی بے ساختہ پن کے شکار نہیں ہیں۔ ان کی جو شاعری میرے پیشِ نظر ہے وہ ایک ایسے فنکار کا تخلیقی ردِ عمل ہے جس کے خیالات اور تجربات شعر میں خاصے بے تکلف انداز میں وارد ہوتے ہیں لیکن ایک خاص سلیقے اور ضبط کے ساتھ۔ لفظ سے ان کا جو معاملہ ہے اور جس طرح وہ معنی کو جذبے کی دھیمی دھیمی آنچ دے کر ایک نئی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے ان کی انفرادیت پسندی اور تجربے نیز تخیل کی تنظیمِ نو کرنے کی تخلیقی ندرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ہم فقیروں کو زمانے کی تب و تاب سے کیا
ہم جہاں بیٹھ گئے اپنی بنالی دنیا

اسے یقین کی منزل پہ لے ہی آیا ہوں
دکھائی دیتی ہے اب اس کو آگ پانی میں

ذوالفقار نقوی ایک مدت سے دشتِ شعر وادب کی سیاحی کر رہے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے منظرِ عام پر آ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اب ان کا تیسرا مجموعۂ شعر شائع ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ مجموعہ بھی شاعری کے پروانوں کے لیے ایک پرکشش شمع کے مانند ثابت ہوگا۔

پروفیسر شہپر رسول
شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر،
نئی دہلی۔ 110025

OO

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

دشتِ وحشت: تگ وتاز

زبان انسان کو خالق باری کی ودیعت کردہ نعمتوں میں سب سے قیمی انعام ہے۔ شاعری نطقِ انسانی کی معراج ہے۔ یہ محض لسانی کمال نہیں بلکہ زبان اور شعور کے باہم اتصال کا نام ہے۔ غالباً اسی تناظر میں شاعر اقبال کی نظر میں ''دیدہ بینائے قوم'' قرار پاتا ہے۔ یہیں سے فنون لطیفہ میں شاعری کی افضلیت اور اوّلیت قائم ہوتی ہے۔ ہمدمِ دیرینہ ذوالفقار نقوی صاحب کی توقیر کی کئی جہتیں ہیں۔ وہ اپنی ہمہ جہت ادبی فعالیت کے سبب ایک وسیع ادبی وعلمی حلقے میں اپنی پہچان رکھتے ہیں تاہم میرے لیے ان کی شاعرانہ تگ وتاز ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ شاعری ان کے نزدیک حظِ محض یا تفنن طبع کا وسیلہ نہیں بلکہ بسیط انسانی دردمندی کی زائیدہ ہے۔ ان کی شاعری کا رخ ان کے صاف ستھرے مذاق اور مقصدِ حیات کی پاکیزگی سے طے پاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے نزدیک ع

ہر ایک حرف سے ہوتی ہے بات مدت تک
میں ڈوب جاتا ہوں جب قلزم معانی میں

غوّاصِ معانی کا یہ عمل نقوی صاحب کے غایت انہماک اور ایک ایک لفظ پر ٹھنڈے دل سے ان کے غور وفکر کا پتہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے شاعری کا یہ شغل اضطراری اور رواروی سے انجام نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا جب شاعر اپنے لیے شعر ڈھالنے کا یہ پیمانہ مقرر کرتا ہے تو اس کا سفر بصارت سے آگے بصیرت کی سرحدوں سے جاملتا ہے۔ وہ قاری کی توقعات میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے محسوسات اس کے مذاقِ لطیف سے ہم آہنگ ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور اس کے اشعار کے در پردہ اس کے لطیف انسانی سوز، دردمندی اور تعمیر پسندی کی زیریں لہروں پر نگاہیں پڑنے

لگتی ہیں۔ اس تناظر میں ذوالفقار نقوی صاحب ہمیں مایوس نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے مثبت شعری رویہ کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کلفتوں سے بھرے آج کے دور میں بھی ان کی رجائی جس پوری طرح بیدار ہے، جس کا اظہار وہ اپنے اشعار میں کرتے ہیں۔ وہ زبان اور لفظیات کے اس سلیقے سے بھی واقف ہیں جو ہماری شعری روایت کا حصہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ فن کے جبلی تقاضوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور قافیہ پیمائی کے عواقب سے بھی باخبر ہیں۔ ع

آپ بیتی کو جہاں بیتی بنا کر پیش کر
قافیہ پیمائی کی قیمت کوئی فن میں نہیں

یہی وجہ ہے کہ وہ تبدیلی کی بات کرتے ہیں اور بیزار یکسانیت سے گریز کرتے ہیں۔ ع

نئے منظر، نئے کردار لاؤ
بڑی بوگس کہانی ہوگئی ہے

ذوالفقار نقوی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فیض یافتہ ہیں۔ اس ماحول سے انھیں مذاق لطیف، ملّی درد اور باخبری کی دولت ہاتھ آئی ہے۔ یہیں سے ان کی شاعری میں ایک خاص مشرقی کیف کی آمیزش ہوئی ہے۔ مذہبی اقدار، سرسید کی فکری صلابت اور روحانی گداز، اصلاح و فلاح، ظلمت سے نبرد آزمائی، زمانہ کی کلفتوں میں اپنی راہ نکالنا، حوصلہ کو صیقل کرنا اور مایوسی کو کفر جاننا۔ یہ اور اِن جیسی اَن گنت خوبیاں ان کے اشعار میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

لے چلو چراغوں کو کر کے خون سے روشن
دشت کی سیاہی نے ہم کو بھی پکارا ہے

سر بچے یا نہ بچے تیرے زیاں خانے میں
اپنی دستار بہر طور بچانا ہے مجھے

ہمارے ساتھ ہے چلنا تو زادِ رہ لے لو
کٹھن سے موڑ ہیں پاؤں پھسل بھی سکتا ہے

غیر ہو جاؤں غیر ممکن ہے
'کُن' سے پہلے کا میں ارادہ ہوں

ذرا دیکھوں تو کتنا دم ہے اِس بادِ مخالف میں
گھروندا اِک سرِ دشتِ بلا تعمیر کرنا ہے
مکانِ لا مکانی کا سفر میرا نہیں رُکتا
تمھاری یاد کو اب پاؤں کی زنجیر کرنا ہے
فیصلہ تقدیر پر چھوڑا تو یہ
بیڑیاں تدبیر کو پہنائے گی
دشت سے خاک اُٹھا لایا تھا اَجداد کی میں
گھر میں رکھی تو ہوئے چاند کے ہالے شب وروز

متذکرہ اشعار کی روشنی میں، ذوالفقار نقوی کے فکروفن اوران کی داخلی کائنات کوسمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ یہ اشعار ان کی طبیعت کے مختلف النوع رنگ کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اجداد کے دشت خاک کی وقعت، تقدیر کے بہانے بے عملی کے نتائج، بادِ مخالف کا سامنا کرنے کا حوصلہ، اپنی دستار کی پاسداری اور بہت کچھ۔ ان میں ایک پختہ شعور کارفرما ہے۔ بڑے سلیقے اور مضبوط قوتِ ارادی کے ساتھ زندگی کو سمجھنے اور برتنے کی للک موجود ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جونقوی صاحب کی دلی ترجمان بن کر قاری کے ادبی مذاق اور شعور کو اپیل کرتی ہے۔ سہل اور رواں شاعری، قافیہ پیمائی سے گریزاں، عرفان و آگہی سے قریب۔ نقوی صاحب شاعری کے جس لطیف پتھ پر اپنے محسوسات کی ڈور تھامے آہستہ خرامی سے چل رہے ہیں وہ بلاشبہ نور اور روشنی کی شاعری ہے۔ اس سے ان کرنوں کے پھوٹنے کا قوی امکان ہے جو شاعر کو اقبال کی نظر میں دیدہ بینائے قوم بناتی ہے۔ نقوی صاحب اپنے قلزمِ معانی کی گنگا سوشل میڈیا پر بہاتے ہیں، جس سے خلقِ خدا سیراب ہورہی ہے۔ توقع ہے کہ 2012 میں شائع ان کے پہلے غزلیہ شعری مجموعہ "اُجالوں کا سفر" کی طرح "دشتِ وحشت" کی بھی خوب پذیرائی ہوگی۔

پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی،
نئی دہلی

صفدر ہمدانی

برطانیہ

'دشتِ وحشت' دراصل دشتِ فکر و ادراک ہے۔

آغازِ کلام میں شکر ہے اُس رب جلیل کا جس نے ہم جیسے بے بساط لوگوں کو قلم کی رفاقت نصیب فرمائی اور حرمتِ قلم کے پاسبانوں میں شامل رکھا اور پھر اس کریم رب کی اس نعمتِ بے پایاں کا بھی شکر یہ کہ ہم طالب علموں کو بابِ شہرِ علم کا تمسک نصیب ہوا۔

میرے محسن اور انتہائی مخلص وصاحبِ علم ذوالفقار نقوی کو ان کے تیسرے مجموعۂ کلام 'دشتِ وحشت' پر قلبی تہنیت کہ اس دور میں جبکہ کتاب پڑھنے والوں کی تعداد از حد کم اور خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے تو برادرِ معظم کتاب کی اشاعت کے جاں گسل مراحل سے گزرتے ہیں۔

میں نوے فیصد دوستوں اور احباب کی کتب پر تبصرے سے گریز کرتا ہوں کہ کتاب کی اشاعت اور قاری کے مطالعے سے قبل اسکو ایک ذہنی میلان کیوں دیا جائے کہ یہ حق قاری کا ہے کہ وہ اپنی رائے قائم کرے کہ صاحبِ کتاب نے شعر کی صنف میں کیا کمال کیا ہے کیا اضافہ کیا ہے اور کہاں کیا کمی رہ گئی ہے، بس اسی کلیے کے تحت میری یہ مختصر سی معروضات فقط اور فقط ایک قاری کی حیثیت سے ہیں، کسی شاعر، ادیب اور صحافی کے طور پر نہیں۔

شعر کے بارے میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ مقررہ وزن اور بحر میں لکھی ہوئی تحریر شعر کہلاتی ہے۔ میرے نزدیک شعر کی یہ تعریف تکنیکی ہے اور ادھوری ہے کیونکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ شعر کی ساری عمارت کی بنیاد خیالِ فکر اور سوچ ہے اور میرا تجربہ ہے کہ ہر خیال اپنی ہیئت ساتھ

لے کر آتا ہے کہ اس نے نظم کا روپ لینا ہے یا غزل کے قالب میں ڈھلنا ہے اور جو اہلِ قلم اس مشق سے گزرتے ہیں وہ اس تخلیقی عمل میں کامیاب رہتے ہیں۔

برادرِ معظم ذوالفقار نقوی کے اس مجموعہ کلام میں موجود شاعری اور گاہے بگاہے انٹرنیٹ پر ان کی جس قدر شاعری میرے مطالعے میں آئی ہے، میں ایک قاری کے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے ہاں خیال کی مضبوطی ہی شعر کی پختگی کی ضمانت ہے۔ حمد ہو نعت یا نظم و غزل ان کے کلام میں خیال کی مضبوطی، انفرادیت اور ندرت کا وصف اہلِ نظر کو صاف نظر آتا ہے۔

میرا ایک زمانے سے یہ فلسفہ ہے کہ پروردگار عالم کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام 'خالق' سو فیصدی اُس کا ذاتی وصف ہے اور اُس نے یہ ذاتی وصف زمین پر اپنے کچھ بندوں کو ودیعت کیا ہے جو اس کے منتخب بندے ہیں اور یہی بندے ربِ کریم کے اس ذاتی وصف تخلیق کے امین بھی ہیں۔ اسی بات کو 1772ء کے شاعر سیموئیل ٹیلر کولرج نے اس طرح کہا ہے کہ شاعری خدا کے تخلیقی کام جیسا عمل ہے اور اس میں ارفع خیال ہی اعلیٰ شعر کی ضمانت ہوتا ہے اور جو چیز شاعری کو نثر سے الگ کرتی ہے وہ وزن ہے، اس مقام پر مجھے یہ ضرور کہنا ہے کہ وزن کا شعور اور فاعلاتن فاعلات کی گردان دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس شعر گو کو وزن کا احساس یا شعور نہیں اسے شاعری سے دور ہی رہنا چاہیے لیکن فقط عروض کو ہی شاعری کہنا خود شاعری کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ ایک علم کے طور پر ہم بھی عروض سے بخوبی واقف ہیں لیکن اس کو بنائے شاعری نہیں سمجھتے۔

یہ عروض کی بات ایک تو میں نے اپنے فلسفہ شاعری کے تناظر میں کی اور دوسرے اس لیے کہ میں نے 'دشتِ وحشت' کو عروض کی کسوٹی پر نہیں بلکہ خیال اور حسنِ خیال کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اس کے نوے فیصد اشعار کو حسین تر پایا ہے کہ بڑی سے بڑی اور مشکل سے مشکل بات نہایت آسان اور سادہ پیرائے میں بیان کر دی ہے جو قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

میں تبصروں میں غزلوں اور نظموں سے اقتباسات بھی دینے سے گریز کرتا ہوں کہ قاری کی انگلی پکڑ کر کیوں چلایا جائے لیکن اپنی پسند کے برادر ذوالفقار نقوی کے دو شعر آپ کی نذر کرتا ہوں۔

میرے ہر خال و خد میں تو ہی ہے
ہُو بہُو دیکھ تیرے جیسا ہوں
ہوں مبارک تجھے کواکب سب
مطمئن ہوں کہ اِک دیا سا ہوں

مجھے یقین ہے کہ ادب کی دنیا میں اس ایک دیے کی روشنی قندیل کی روشنی کے برابر ہے۔

OO

معید رشیدی
شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ذوالفقار نقوی کی شاعری

شاعری انسان کے متنوع افکار و محسوسات کی آئینہ دار ہے۔ ہر شاعر اپنے اقلیم معنی کے ساتھ جہانِ شعر میں داخل ہوتا ہے۔ انفراد و اختصاص بعد کا مسئلہ ہے۔ کسی شاعر کو پڑھتے ہوئے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی جڑیں روایات میں کس حد تک پیوست ہیں؟ آج کل زیادہ تر شعرا شعر گوئی میں مصروف تو ہیں، انھیں داد بھی ملتی ہے، وہ مشاعروں میں بلائے بھی جاتے ہیں، سوشل میڈیا پر بھی ان کا دبدبہ ہے لیکن باریکی سے کلام کا مطالعہ کیجیے تو سخت مایوسی ہاتھ آتی ہے۔ اس کا سبب عجلت کے سوا کچھ نہیں۔ سوشل میڈیا ارتباط کا محض ایک میڈیم ہے۔ یہاں سنجیدگی کے ساتھ بہت کچھ کر گزرنے کی گنجائش نہیں۔ اس لیے اس کو قطعاً معیار نہیں بنایا جا سکتا۔ سوشل میڈیا پر مشہور ہو جانا، کسی شاعر کے اچھے یا برے ہونے پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ اکثر شبہات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ذوالفقار نقوی معاصر اردو شاعری میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ سوشل میڈیا پر بھی سرگرم ہیں۔ فیس بک پیج چلاتے ہیں، لیکن ان میں اور دیگر اصحاب میں فرق یہ ہے کہ ان کا مقصد خالصتاً شعر و ادب کی ترویج و اشاعت ہے۔ اِن کی ترجیح ایک ایسے پلیٹ فارم کو تیار کرنا ہے جو سنجیدہ قلم کاروں کے لیے مختص ہو۔ اِس طرح وہ شعر تو کہتے ہیں لیکن ادبی گہما گہمی پر نظر رکھتے ہوئے نئے نئے شعرا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے ایک تسلسل کو فروغ بھی دیتے ہیں۔ یہ سرگرمی انھیں ادب کے مسائل سے جوڑے رکھتی ہے۔

ذوالفقار نقوی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہاں طالب علم کسی بھی شعبے کا ہو، چائے اور شاعری اس کے خون میں شامل ہو جاتی ہیں، اور تا عمر یہ دونوں اس کے

خون میں گرمی پھونکتی رہتی ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں، اور سب سے بڑی بات ہماری شعری روایتوں سے باخبر ہیں۔ ان کی لفظیات، تراکیب، استعارے اور معنی خلق کرنے کے بعض وسائل ان کے صاف ستھرے ذوق کی غمازی کرتے ہیں۔ ذات سے منسلک مسائل، مذہبی سیاق وسباق، گردشِ زمانہ، اصلاحی سروکار، مثبت رویہ اور ظلمت میں نور پھونک دینے کی روحانی کاوش ان کی شعری تہوں میں دریافت کی جاسکتی ہے۔ فقر اور بے نیازی اچھی اور بڑی شاعری کی اوّلین شرائط میں ہیں۔ مجموعی طور پر کسی کے یہاں یہ کس طرح برتے گئے ہیں، دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ ذوالفقار صاحب کو ان دونوں سے دلچسپی ہے۔ یہ پہلو جب ان کی شاعری میں درآتے ہیں تو کمال کرتے ہیں:

خاک زادوں کے لیے خاک تھی خالی دنیا
وجد میں آئے تو ہاتھوں میں اُٹھا لی دنیا

ہم فقیروں کو زمانے کی تب و تاب سے کیا
ہم جہاں بیٹھ گئے اپنی بنا لی دنیا

سرِ دشتِ جنوں اُگتی سیاہی
متاعِ زندگانی ہو گئی ہے

ذوالفقار نقوی کے یہاں غالب طور پر مثبت رویہ نظر آتا ہے۔ وہ کبھی زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔ مایوسی ایک فطری جذبہ ہے لیکن فرد کی انفرادیت اس بات میں پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ مسائل میں اپنے لیے کسی طرح وسائل پیدا کرلیتا ہے۔ یہ ایک روحانی عمل ہے جس میں لفظ کہیں کہیں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ کیفیت غالب آجاتی ہے۔ جب کیفیت غالب آتی ہے تو شعر ایک مقام پر پہنچ جاتا ہے اور قاری اس مقام پر خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔ کیفیت سے کیفیت ملتی ہے۔ جذبہ نئے منطقوں سے ہمکلام ہوتا ہے اور ایک نئی دنیا کی تعمیر کے لیے راہ ہموار ہوجاتی ہے:

مرا یقین سے جو سلسلہ مِلا ہوا ہے
کسی سے میں نے بھی اب رابطہ کیا ہوا ہے

اندھیروں سے اُلجھنے کی کوئی تدبیر کرنا ہے
کوئی روزن کسی دیوار میں تسخیر کرنا ہے

شعور و فکر سے آگے نکل بھی سکتا ہے
مرا جنون ہواؤں پہ چل بھی سکتا ہے

لے چلو چراغوں کو کر کے خون سے روشن
دشت کی سیاہی نے ہم کو بھی پکارا ہے

ذرا دیکھوں تو کتنا دم ہے اِس بادِ مخالف میں
گھروندا اک سرِ دشتِ بلا تعمیر کرنا ہے

ذوالفقار نقوی کے ایسے اشعار قارئین کو داد دینے پر مجبور کرتے ہیں۔'زادِ سفر' اور 'اُجالوں کا سفر' کے بعد ان کے نئے شعری مجموعے 'دشتِ وحشت' کے لیے میں انھیں مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا یہ مجموعہ باذوق قارئین تک پہنچ کر تحسین کا مستحق قرار پائے گا۔

ہر ایک حرف سے ہوتی ہے بات مدت تک
میں ڈوب جاتا ہوں جب قلزمِ معانی میں

OO

مجید اختر

ہوسٹن۔امریکہ

دشتِ وحشت کا مسافر

مسلسل کانوں میں یہ آواز پڑتی رہتی ہے کہ دنیا سمٹ کر ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ دس بارہ برس ہوئے کہ سوشل میڈیا نے بھی اس ولیج میں اپنی ایک مستقل جگہ بنالی۔ پھر یوں ہوا کہ سات سمندر دور کے ادیب اور شعرا لمحوں کی نزدیکی پر آ گئے۔ ایسے پلیٹ فارمز میسر آ گئے جہاں نہ صرف ایک دوسرے سے تعارف ہوئے بلکہ بہت مستقل بنیادوں پر دوستیوں اور تعلقات کی صورت پیدا ہوگئی۔ بے شمار ایسی تخلیقات جو ایک دوسرے تک شاید کبھی پہنچ ہی نہ پاتیں، منٹوں بلکہ سیکنڈوں میں آپ تک پہنچ جاتی ہیں۔ سوشل میڈیا کی اس برق رفتاری اور ہبڑ دبڑ میں ایک دھیرج شعار اور تحمل مزاج ادبی شخصیت سے تعارف ہوا اور یہ تعلق دیکھتے ہی دیکھتے ایک پر خلوص دوستی کی صورت اختیار کر گیا۔

کشمیر کی جنت نظیر وادی سے تعلق رکھنے والے سید ذوالفقار نقوی صاحب اپنی بردباری، نرم مزاجی، شفقت و محبت کے علاوہ اپنی کومل شاعری کے سبب دل میں گھر کرتے چلے گئے۔ خوشا نصیب کہ آج اِن کا نیا مجموعۂ کلام پیشِ نظر ہے۔

دنیا کی تند مزاجی کے سبب سید صاحب نے اسے ایک دشتِ وحشت سے تعبیر کیا اور یہی اِس مجموعہ کا نام بھی قرار پایا۔ سوشل میڈیا کے شور شرابے، فوری شہرت پانے کے ہتھکنڈے، گروپ اور دھڑے بازیاں، اِن سب سے بے نیاز نقوی صاحب سر جھکائے اپنے کام میں منہمک رہے۔ سخن کی دیوی نے یہ انہماک دیکھا تو قلبِ شاعر پہ تجلی کی اور قلم گہربار ہوگیا۔ مروجہ مضامین اور پامال زمینوں سے بچتے ہوئے نقوی صاحب مسلسل مضامینِ تازہ کا اس طرح انبار لگاتے چلے گئے کہ یکے بعد دیگرے ان کا تیسرا شعری مجموعہ آپ کے سامنے موجود ہے۔

کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ٹیبل لیمپ روشن کیجئے اور وادیٔ کشمیر کے جنت نظیر حسن اور جھیل ڈل کے پر سکون پانیوں کی سی اِس کتاب کی سیر کیجئے۔

کوئی عصا بھی نہیں اور پھر اکیلا تو
امیرِ شہر کا اژدر نگل بھی سکتا ہے

ذرا دیکھوں تو کتنا دم ہے اِس بادِ مخالف میں
گھروندا اِک سرِ دشتِ بلا تعمیر کرنا ہے

اُٹھ رہی ہیں دل سے پھر چنگاریاں
ظلم کی ہر اک دکاں جل جائے گی

یہ جس مقام پہ تم نے اکیلا چھوڑا ہے
ہم ایسوں کی لئے مشکل یہ مرحلہ بھی نہیں

ویراں پڑے ہوئے ہیں سارے کتاب گھر
جب سے ہوا ہے گوگل بازارِ آگہی

خداوندِ عز و جل سے دعا ہے کہ نقوی صاحب کی یہ کاوش بھی بار یاب ہو اور سخن دانوں اور سخنوروں میں مقبول ہو۔

OO

ڈاکٹر شمس کمال انجم
صدر شعبۂ عربی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری

ذوالفقارؔ نقوی کو میں تقریباً دو عشروں سے جانتا ہوں۔اسی لیے ان کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ سراپا شاعر ہیں اور شاعری سے انھیں جنون کی حد تک عشق ہے۔وہ فراق کی طرح انگریزی کے استاد ہیں مگرانہوں نے اردو شاعری کی زلفوں کی مشاطگی کو حرزِ جاں بنا رکھا ہے۔اس کی کاکلوں کو سجانا سنوارنا ہی صبح وشام اور روز وشب کا ان کا مشغلہ ہے۔اس مشغلے نے انہیں ایک امتیازی شناخت عطا کی ہے۔ایک منفرد پہچان عطا کی ہے۔وہ بحیثیت شاعر اعتبار کی منزلیں چڑھ چکے ہیں اور دانش گاہِ سخن سے قبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

ذوالفقارؔ نقوی کے احساس اور اظہار کی پرتوں کو کھولا جائے تو یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ سطحی افکار وخیالات اور گھسے پٹے مضامین سے دامن تہی کر کے ہمیشہ جدت آمیزی کی کوشش کرتے ہیں۔نئی زمینوں اور نئے قافیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔زمانے کے رویوں، نشیب وفراز اور اُتار چڑھاؤ کو اپنے تجربات کی خراد پر چڑھا کر انھیں شعر کی صورت میں پیش کر کے سماج کو آئینہ دکھاتے ہیں۔حیات وکائنات اور انفس وآفاق کی ترجمانی سے لے کر غمِ جاناں اور غمِ دوراں کے مشکلات ومسائل کو غزل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ان کی شاعری زبان وبیان کی سادگی، لہجے کی شگفتگی اور سلاست وروانی سے معمور وہ کلام ہے جسے دور سے ہی پہچانا جاسکتا ہے۔

نقوی صاحب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعر گوئی کے ساتھ شعروسخن کی ماحول

سازی کا بھی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ منتہائے فکر عالمی گروپ کے ذریعے وہ کئی سال سے شعر وسخن کی روشنی پھیلا رہے ہیں۔ اور ساری دنیا کو شعر وسخن سے منور کر رہے ہیں کیونکہ ذوالفقار نقوی کا اوڑھنا بچھونا ہی شاعری ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔ تازہ اشعار سے آراستہ تازہ مجموعۂ کلام آپ کے سامنے ہے۔ آپ خود اس کا مطالعہ کریں اور ان کے شعر وسخن کی وادیوں میں چہل قدمی کر کے ان کے افکار وخیالات اور احساس واظہار کے گل بوٹوں سے اپنے مشامِ جاں کو معطر رکھیں۔ نقوی صاحب کا ادبی سفر ہنوز جاری ہے۔ ابھی انھیں بہت دور جانا ہے اور اس کے لیے وہ پورے تن من دھن سے لگے بھی ہوئے ہیں۔ ان سے ہمیں بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ع

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

OO

اِظہارِ تشکر

خداوندِ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اپنا تیسرا شعری مجموعہ "دشتِ وحشت" آپ کے ذوقِ سلیم کے حوالے کر رہا ہوں۔ میں اپنے احساسات، جذبات، مشاہدات نیز زندگی کے نشیب فراز اور اُتار چڑھاؤ کے حسّی ردِّ عمل کو زیبِ قرطاس کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں یہ صرف قاری ہی بتا سکتا ہے۔

میرے اِس طویل شعری سفر میں جن احباب نے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے، میں اُن کا دلی طور پر شکر گزار ہوں۔ رفیقِ حیات اور بچوں کا از حد ممنون و سپاس گزار ہوں کیونکہ اُن کے تعاون کے بغیر یہ سب کچھ امکانات سے پرے تھا۔ یہ اَمر میرے لیے باعثِ مسرت و افتخار ہے کہ میرے برادران و خوہران نیز اقرباً میں بعض خود شاعر و ادیب ہیں اور دیگر سب کو ادب سے بہت شغف ہے۔ اِن سب نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے اور مجھے برداشت کیا ہے۔ میں اِن سب کا متشکر ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ انھیں سلامت رکھے۔

محترم حقانی القاسمی تنقیدی بصیرت سے مالا مال اُس ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے جنھیں تمام اردو دنیا عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ میں حقانی صاحب کا نہایت ہی متشکر و ممنون ہوں کہ اُنھوں نے میرے شعری فن پر ایک جامع مضمون سے نوازا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے استاد اور نامور شاعر و محقق پروفیسر شہپر رسول صاحب کا از حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہایت اختصار کے ساتھ خوبصورت انداز میں میری عزت افزائی کی ہے۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی دہلی کے اُستاد، ماہرِ لسانیات، محقق، ناقد اور اُردو دان پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اُستاد اور عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعر

پروفیسر معید رشیدی صاحبان کا احسان مند ہوں کہ انھوں نے میرے کلام پر مفصل مضامین تحریر کر کے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔

بی بی سی لندن کے سابقہ نیوز براڈ کاسٹر، میرے نہایت شفیق اور مہربان دوست جناب صفدر ہمدانی کا شیریں و پُر تاثیر لہجہ لڑکپن سے میرے کانوں میں رَس گھولتا چلا آرہا ہے۔ ہمدانی صاحب نے میرے کلام کو اپنے ''عالمی اخبار'' میں ہمیشہ جگہ دی ہے اور میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اُن کی محبتوں کا مقروض ہوں کہ انھوں نے اِس مجموعۂ کلام پر بھی اپنے خوبصورت تاثرات سے نوازا ہے۔

امریکہ میں مقیم ممتاز شاعر اور میرے شفیق بزرگ دوست جناب مجید اختر کا نہایت ہی ممنون و متشکر ہوں کہ انھوں نے بے پناہ محبتوں سے نوازا ہے۔

محترم ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبۂ عربی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری کے ذکر کے بغیر میرا اَدبی سفر نا تمام سا لگتا ہے۔ گزشتہ بیس برس سے میری ہر تخلیق اور قلبی واردات کے وہ پہلے سامع ہیں اور ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ میرے اِس شعری مجموعہ پر ایک مختصر مگر جامع مضمون تحریر کرنے کے لیے اُن کا دلی طور پر شکر گزار ہوں۔

''منتہائے فکر'' عالمی ادبی ادارے کے منتظمین جناب ڈاکٹر الیاس نوید گنوری، جناب عرفان ستار، جناب خوشبیر سنگھ شادؔ، جناب اعجاز اسد، جناب خورشید بسملؔ، جناب شمشاد شادؔ، جناب کامل جنیٹوی، جناب ارشد جمال صارمؔ اور تمام اراکین کی محبتوں کا بھی مقروض ہوں کہ انھوں نے میری ہمیشہ عزت افزائی کی ہے۔

آپ تمام قارئین کے بے لاگ تبصروں اور آرا کا بے تابی سے انتظار رہے گا۔

احقر

ذوالفقار نقوی

OO

حمدِ ربِ ذوالجلال

راز بھی تُو ہے رازداں تُو ہے
منکشف ہو کے بھی نہاں تُو ہے

میری منزل ہے میرا جادہ بھی
میری عقبیٰ مرا جہاں تُو ہے

تُو سمندر ہے میں ہوں اِک قطرہ
میں اکیلا ہوں کارواں تُو ہے

ریگزاروں میں جسم شل میرا
میں ہُرا دشت سائباں تُو ہے

رات دن میں پھروں سرابوں میں
ہر حقیقت کا ترجماں تُو ہے

میں درون و برون سے خارج
ذرّے ذرّے میں ضو فشاں تُو ہے

ہفت اَقلیم سلطنت تیری
میں ہوں محکوم حکمراں تُو ہے

OO

نعت

وفورِ وحشتِ صحرا میں سائباں کے لئے
وہ لامکان سے اُترا ہے ہر مکاں کے لئے

کوئی ہو آپ سا محراب میں مصلے پر
بلال خلد سے آ جائیں پھر اذاں کے لئے

نیازِ شوقِ سجود و قیام کو لے کر
تڑپ رہا ہوں ترے سنگِ آستاں کے لئے

کھڑے ہیں آدمؑ و الیاسؑ و یونسؑ و عیسیٰؑ
نظر ہے سُوے حرم میرِ مرسلاں کے لئے

مرے یقیں کا مصلی بچھا ہواؤں پر
میں جسم و جاں سے جو نکلا کبھی وہاں کے لئے

وہ جس کے جسم کا سایہ نظر نہیں آتا
وہی تو اصل میں سایہ ہے ہر جہاں کے لئے

OO

اندھیروں سے اُلجھنے کی کوئی تدبیر کرنا ہے
کوئی روزن کسی دیوار میں تسخیر کرنا ہے

ذرا دیکھوں تو کتنا دم ہے اِس بادِ مخالف میں
گھروندا اِک سرِ دشتِ بلا تعمیر کرنا ہے

نکل آیا ہے جو بیداد راہوں پر دلِ بے خود
کوئی ناوک فگن آئے اِسے نخچیر کرنا ہے

سرِ دشتِ جنوں جو بے خودی کے پھول کھلتے ہیں
اُنھیں روشن دماغوں کے لئے اکسیر کرنا ہے

مکانِ لا مکانی کا سفر میرا نہیں رُکتا
تمھاری یاد کو اب پاؤں کی زنجیر کرنا ہے

OO

دھواں تھا چار سو اتنا کہ ہم بے انتہا روئے
لگی جو آگ بستی میں تو سارے مبتلا روئے

عجب حِدّت مرے اَطراف میں جلوہ فروزاں تھی
کہ میری خاک سے شعلے لپٹ کر بار ہا روئے

مری آواز گونجے اِس طرح پتھر کے سینوں میں
کہ اُن کے دل کے خانوں میں چھپا ہر اژدھا روئے

الٰہی بھیج دے ایسا کہ جس کے خوف سے فوراً
اَنا سر پیٹتی جائے، جفا کا نا خدا روئے

مرے آغاز میں مجھ کو ہی رونا تھا، سو میں رویا
نہ جانے کیوں مرے اَنجام پر شاہ و گدا روئے

○○

تیری تخلیق کا خلاصہ ہوں
تُو مصوّر، میں تیرا نقشہ ہوں

منعکس مجھ سے صورتیں تیری
اِس تماشے کا میں ہی پردہ ہوں

غیر ہوجاؤں غیر ممکن ہے
'کُن' سے پہلے کا میں اِرادہ ہوں

تیرگی مجھ سے کیوں نہ ہو خائف
روشنی کا میں اِستعارہ ہوں

مجھ سے اُمّیدِ بے گناہی کیوں
آدمی ہوں کہ میں فرشتہ ہوں؟

OO

مجھ کو تیری چاہت زندہ رکھتی ہے
اور تجھے یہ حالت زندہ رکھتی ہے

ڈھو ڈھو کر ہر روز جسے تھک جاتا ہوں
اُس ساماں کی سنگت زندہ رکھتی ہے

چڑھتے سورج کی میں پوجا کرتا ہوں
یار یہی اک خصلت زندہ رکھتی ہے

چوم کے ہاتھوں کی ریکھائیں سوتا ہوں
خوابوں کی یہ دولت زندہ رکھتی ہے

پل دو پل آنگن میں تیرے رہتا ہوں
ایک یہی تو فرصت زندہ رکھتی ہے

OO

یہ کلیوں کی نہ پھولوں کی مہک ہے
مری مٹی ہے، میری ہی مہک ہے

مرے دشتِ سخن سے کون گزرا
یہ کس کی اب تلک باقی مہک ہے

کہاں سے آئے ہیں شعلے بتاؤ
کہ اِن میں جانی پہچانی مہک ہے

کسی آہٹ پہ میری سانس اُکھڑی
مگر سانسوں میں البیلی مہک ہے

ہوا پر غیر کا قبضہ ہے لیکن
بسی اِس میں فقط تیری مہک ہے

○○

غرقِ طوفاں ہے کنارہ صبر کا
کون لکھّے گوشوارہ صبر کا

کرب کے بادل گھنے ہیں اِس قدر
کھو گیا ہے اَبر پارہ صبر کا

دیکھ چہرے پر مَلا ہے خونِ دل
بر محل ہے استعارہ صبر کا

نقطہ نقطہ جس کا ہو گا سائباں
آ رہا ہے وہ شمارہ صبر کا

دیکھنا نکلے گا اِک دن ذوالفقارؔ
غرب سے کوئی ستارہ صبر کا

OO

کب تلک جانے رہیں گی بے سر و سامانیاں
ناگ بن کر ڈس رہی ہیں دم بدم ویرانیاں

کوچہ و بازار خالی، گھر ہوئے ماتم کدے
آسماں بھی اب نہیں سنتا یہ نوحہ خوانیاں

سُن رہے ہیں ایک جرثومہ ہے بھاری دہر پر
بے ثمر ہیں حکمتیں، بے سود سب نگرانیاں

آزمائش کی گھڑی ہے، آؤ کر لیں کچھ حساب
کس قدر ہم سے ہوئیں ہیں لغزشیں، نادانیاں

گر سکونِ قلب ہے مطلوب تجھ کو ذوالفقارؔ
چھوڑ دے ایذا رسانی اور نافرمانیاں

OO

بال بال دنیا پر حکم بس تمھارا ہے
وقت خالی ہاتھوں سے ہم نے بھی گزارا ہے

یم بہ یم اُبلتا ہے، کو بہ کو ہے برسا بھی
خونِ آدمیت نے نقشِ لا سنوارا ہے

لے چلو چراغوں کو کر کے خون سے روشن
دشت کی سیاہی نے ہم کو بھی پکارا ہے

زادِ راہ کا ہم سے کیوں سوال کرتے ہو
رہزنوں کے نرغے میں جب ہمیں اُتارا ہے

ہر نفس قفس میں ہیں، کیسے مان لیں یارب!
اَب کھُلی فضائیں ہیں، آسماں ہمارا ہے

OO

دشتِ بلا کی دھوپ میں تھوڑی نمی سی ہے
شاید مرے جنون میں کوئی کمی سی ہے

بے رہ روی کی موج میں بہہ جائے گی کہیں
اِنسانیت کی گرد جو ہم پر جمی سی ہے

اِک بار میرا نام کیا محفل میں آ گیا
اُس کی نظر میں آج بھی کچھ برہمی سی ہے

اے میرِ کارواں کبھی صحرا سے یہ بھی پوچھ
کیوں اب تلک یہ ریگِ تپاں شبنمی سی ہے

اِک دلفریب سا یہ پڑاوَ تو ہے مگر
خوشیاں ہیں چار دن کی سزا دائمی سی ہے

OO

میری آنکھوں میں بہت دیر رُکا رہتا ہے
آئینہ خانے کا منظر جو خفا رہتا ہے

لمس سے کس کے مری خاک ہے مہکی جاتی
میرا اِدراک بھی خوشبو سے رَچا رہتا ہے

اِس نے ناداروں میں بانٹے ہیں خزانے اکثر
وقت کی گرد سے دامن جو اَٹا رہتا ہے

میری آواز پہ لبیک کہاں سے آئی
کیا کوئی میرے تعاقب میں لگا رہتا ہے؟

کس کے خوں سے ہیں مزیّن یہ کھلونے صاحب
تیرا گھر جن سے ہمہ وقت سجا رہتا ہے

OO

طبیعت ایسا ٹونا کر گئی ہے
کہ زخموں کو توانا کر گئی ہے

نہ پوچھو میری آشفتہ سری کا
مجھے بہلول دانا کر گئی ہے

سمجھتا ہوں زباں اِن پتھروں کی
مجھے مٹی سیانا کر گئی ہے

جو اک تصویر محوِ گفتگو تھی
وہ پتھر میں ٹھکانا کر گئی ہے

کہاں سے آئی ہے خوشبو تمھاری
ہر اِک موسم سہانا کر گئی ہے

OO

اُس کی نظروں سے کیا گرا ہوں میں
دشت و صحرا سا ہو گیا ہوں میں

میری مٹی میں کس کی حدّت ہے
جسم اپنا جلا رہا ہوں میں

یوں تو صدیاں گذار دیں لیکن
ایک لمحے پہ ہی کھڑا ہوں میں

ایک لمحے کی جستجو ہے بس
پھر بھی صدیوں سے مبتلا ہوں میں

اے سرِ بے نیاز دیکھ تو لے
کس کی دہلیز پر پڑا ہوں میں

OO

دشت میں ہم گھروندے بناتے رہے
آندھیوں کے تھپیڑے بھی کھاتے رہے

کرب کا غیر سے ذکر ممکن نہ تھا
ہم فقط قربتیں آزماتے رہے

آبلوں نے دیا عمر بھر ساتھ، پر
راستے اپنا دامن چھڑاتے رہے

منزلوں کا پتہ جیب میں تھا مگر
ساتھ ہم مشکلوں کا نبھاتے رہے

خیمۂ عقل کی تھیں طنابیں کٹیں
فیصلوں کے قدم لڑکھڑاتے رہے

○○

ایسے امّید کے پالے ہوئے اشجار گرے
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

اِن فصیلوں کی بلندی پہ نہ سرمایہ لگا
بچ نہیں سکتا اگر اَوج سے معمار گرے

دُھل گئی دامنِ حسرت پہ جمی مَیل سبھی
جوں ہی پلکوں پہ رُکی موج کے اَسوار گرے

کاش مِٹ جائیں عنایت کے حوالوں کے نقوش
نام سنتے ہی ترا، سر سے نہ دستار گرے

زلزلہ اُن کی منڈیریں بھی تو محسوس کریں
دشت میں میرے گھروندے کی جو دیوار گرے

OO

کوئی چنگاری اُٹھی گر تو ہوا ہی دیں گے
آشیاں میرا مرے یار جلا ہی دیں گے

شمعِ امّید پہ کر سایۂ ایقاں، ورنہ
بے یقینی کے تھپیڑے ہیں بجھا ہی دیں گے

ہوں گنہگار مگر ذکرِ نبیؑ ہے لب پر
میرے سرکار مری آپ گواہی دیں گے

وہ سرِ بزم خموشی میں ہیں لپٹے لیکن
کوئی نشتر مرے سینے پہ چلا ہی دیں گے

ہم نہ کہتے تھے کھُلے رکھتی ہیں دیواریں، کان
بات کا تیری بتنگڑ یہ بنا ہی دیں گے

OO

میں اپنے سینے میں جتنے بھی داغ رکھتا ہوں
قسم خدا کی چھلکتے اَیاغ رکھتا ہوں

ہواؤ جان کھپاؤ نہ تُند جھونکوں پر
تمھاری راہ میں لا کر چراغ رکھتا ہوں

مرے سخن میں نہ ڈھونڈو خرابیاں صاحب
تمھاری زیست کا اِس میں سراغ رکھتا ہوں

فریبِ نقشِ تمنا سے کون بچتا ہے
شعورِ ہست میں لیکن دماغ رکھتا ہوں

ہر اک دریچے سے بادِ خزاں ٹپکتی ہے
دل و نگاہ میں لیکن میں باغ رکھتا ہوں

OO

کچھ اور بھی ہے صاحبو! اِس این وآں کے بعد
دیکھے کبھی تو جا کے کوئی لامکاں کے بعد

یہ راز وَا ہوا شبِ اَسریٰ جہان پر
کچھ اور آسمان ہیں اِس آسماں کے بعد

اہداف، منزلیں، حدیں، اِن کی نہ بات کر
چلنا پڑے گا اور بھی اِس آستاں کے بعد

کل رات حُسنِ یار ہی تھا میرے رُوبرُو
یا واہمہ تھا آنکھ میں شامِ جواں کے بعد

سامانِ ہست و بود پہ اِترا نہ ذوالفقارؔ
بازار ہے اِک اور بھی تیری دکاں کے بعد

OO

موج میری ذات کی قائل کہاں
میں کہاں ہوں اور وہ ساحل کہاں

وہ مری گلیوں سے گذرا ہی نہیں
میرے کرب و درد میں شامل کہاں

نرگسیت چھلنی چھلنی کر گئی
میرا سینہ پیار کے قابل کہاں

اُٹھ رہا ہے شور لفظوں سے بہم
بھاگتا ہے فکر کا قاتل کہاں

تیرے حصّے پر ہے قابض ذوالفقارؔ
اب تو اپنے آپ کا حامل کہاں

OO

پہلوے دل سے کوئی خار نکالا نہ گیا
درد ایسا تھا کہ پالا بھی تو پالا نہ گیا

اِک سوالی کی طرح مانگ لیا سر اُس نے
اور مجھ سے بھی سرِ بزم وہ ٹالا نہ گیا

نام آتے ہی سرِ بزم تمھارا لب پر
سر سے دستار گئی، سر بھی سنبھالا نہ گیا

یوں تو آنے کو بہت آئے مری قسمت میں
کوئی بھی سکّہ مگر مجھ سے اُچھالا نہ گیا

اُن کی تصویر نگاہوں میں بسا رکھّی تھی
اور محفل سے کئی روز اُجالا نہ گیا

OO

دیکھا نہیں ہے یار کی جب سے گلی کا رُخ
چمکا ہے اُس کے بعد مری دلبری کا رُخ

تو نے تو لا کے ڈال دیا دشت میں مجھے
پر مجھ کو راس آیا بہت بے بسی کا رُخ

ہوتا نہیں ہے مجھ پہ فسوں کوئی کارگر
گو دیکھتا ہوں صبح و مسا سامری کا رُخ

نادان خوش ہیں خندہ زنی پر مری مگر
اے کاش دیکھ لیتے مری بے کلی کا رُخ

آشفتہ سر ہوں دیکھ لیا تُو نے ذوالفقارؔ
اب آ کے دیکھ لے مری دیدہ وری کا رُخ

OO

ہفت اقلیم پہ دن رات نظر رکھتے ہیں
بے خبر ہوتے ہوئے ساری خبر رکھتے ہیں

کیوں ہو طغیانیٔ دریا کا اُنھیں خوف کہ جو
اپنی کشتی میں ہمہ وقت بھنور رکھتے ہیں

اُن کی گفتار نہ کردار نہ خوشبو کوئی
سر پہ دستار وہ دادا کی مگر رکھتے ہیں

رات بھر ہالۂ مہتاب نظر آتا ہے
اُن کی تصویر خیالوں میں اگر رکھتے ہیں

خاک میں رہتے ہوئے خاک نہیں بھاتی کیوں
دُشمنی ایسے کہاں ماں سے پسر رکھتے ہیں

OO

گو کہ ادنیٰ سا اِک بتاسا ہوں
اَبر بن کر جہاں پہ برسا ہوں

جانفزا ہیں اَدائیں سب میری
کون کہتا ہے جان فرسا ہوں

ہوں مبارک تجھے کواکب سب
مطمئن ہوں کہ اِک دیا سا ہوں

میرے ہر خال و خد میں تُو ہی ہے
ہُو بہُو دیکھ تیرے جیسا ہوں

تشنگی روز بڑھتی جاتی ہے
اِک سمندر ہوں اور پیاسا ہوں

OO

صحرا کی سمت جب کبھی یہ لوگ جائیں گے
ذرّے ہمارے درد کا نوحہ سنائیں گے

اے وقتِ نا مراد ٹھہر جا نہ یوں نچا
اب اور تیرے ساتھ نہ ہم دوڑ پائیں گے

دل کو کیے ہوئے ہے کوئی زخم چاک چاک
درد آشنا بھی ہو کوئی جس کو دکھائیں گے

گھیرا ہوا ہے تیرہ شبی نے کچھ اِس طرح
اپنی نگاہ میں کوئی سورج اُگائیں گے

ہم لے کے اپنی خاک چلیں گے جو سوے خاک
سجدۂ شکر کے لیے وہ ساتھ آئیں گے

OO

اِس قدر ٹینشن نہ پالا کر
خون اپنا نہ تُو اُبالا کر

کاٹ لے میرا سر، مگر ظالم
میری دستار مت اُچھالا کر

بخل سے باز آ! مہِ تاباں
میری راتوں کو بھی اُجالا کر

ہر کسی در پہ کب یہ جاتے ہیں
میرے ایسوں کو یوں نہ ٹالا کر

اے مرے درد آ! گلے لگ جا
میں ترا ہوں، مجھے سنبھالا کر

OO

مرا یقین سے جو سلسلہ مِلا ہُوا ہے
کسی سے میں نے بھی اب رابطہ کیا ہُوا ہے

یہ ہاتھ اب تجھے ہرگز میں دے نہیں سکتا
ازل کے دن سے کسی اور کو دِیا ہُوا ہے

لباسِ جسم ہے مَیلا، پھٹا ہُوا لیکن
کسی کے دستِ محبت نے یہ سِیا ہُوا ہے

خدا کرے کہ وہ اِس بار چوک جائے پھر
کماں پہ اُس کی جو تیرِ ستم ٹِکا ہُوا ہے

کسے ہے تاب خریدے، وہ سر زمانے میں
گلی میں یار کی اک بار جو بِکا ہُوا ہے

OO

زندگی بول ترے ساز پہ گاؤں کب تک
بے سُری تال پہ اب پیر چلاؤں کب تک

ایک جھونکے سے جو گر جاتے ہیں ہر روز یہاں
ایسے ناپید گھروندے میں بناؤں کب تک

جس کے سائے میں میسر نہیں کوئی راحت
ایسا بے فیض علم اور اُٹھاؤں کب تک

راستہ تیرا جدا، اور مری سمت الگ
اِس طرح یار ترا ساتھ نبھاؤں کب تک

رینگتی جوں بھی نہیں کان پہ اب منصف کے
بے گناہی کا بتا شور مچاؤں کب تک

OO

ٹیک لگا کر بیٹھا ہوں میں جس بوڑھی دیوار کے ساتھ
مٹ جاؤں گا میں بھی شاید اِس کے ہر آثار کے ساتھ

غازہ پوڈر مل کر میں بھی آ جاتا ہوں سرخی میں
بک جاتا ہے چہرہ میرا سستے سے اخبار کے ساتھ

نام پہ تیرے بٹتے ہیں اب شہر میں نقلی سب تریاق
کر جاتا ہے دھوکا کوئی بستی میں بیمار کے ساتھ

ہوش کے ناخن لے تو سائیں کیوں یہ غوغا ڈالا ہے
دیکھ، نہیں اب لَے یہ چلتی نغمۂ دربار کے ساتھ

کس نے تجھ کو سونپی بھائی سرداری اِس بستی کی
سب کے سب محشور یہ ہوں گے اپنے یار کے ساتھ

OO

بستی میں سب کو جس سے تقاضا وفا کا تھا
مغرور، خود پرست، وہ بندہ انا کا تھا

میں محوِ یادِ یار تھا، بے فکر، مطمئن
جب خوف سارے شہر پہ طاری وَبا کا تھا

ہم پیشِ ظلم و جور کبھی خم نہیں ہوئے
سودا ہمارے سر میں فقط کربلا کا تھا

کانوں میں اُس کے اُنگلیاں، حیران تھے سبھی
درپیش مسئلہ اُسے میری صدا کا تھا

کچھ لوگ بھیک زندگی کی مانگتے رہے
کچھ من چلوں کے ہاتھ میں ڈنڈا خدا کا تھا

OO

وحشت شباب پر، تو فسوں ہے سراب کا
ہم کو گمان تک نہ تھا ایسے نصاب کا

کھولی نہ اُس نے عمر بھر اپنی زباں مگر
چرچا ہے سارے شہر میں اُس کے جواب کا

اک بلبلۂ آب تھا، اُٹھتے ہی مٹ گیا
لیکن لبوں پہ اب بھی ہے قصہ شباب کا

جب سے درونِ ذات کے پردے ہیں اُٹھ رہے
دیکھا کیے ہوں روز ہی چہرہ جناب کا

اے قیس! اَب جنوں نہیں چڑھتا کسی کے سر
ہر باب ناتمام ہے تیری کتاب کا

OO

لحظہ لحظہ دل مچلنا چاہیئے
اَب دیوں میں خون جلنا چاہیئے

سورجوں کی تاب لے کر آنکھوں میں
تیرگی کی رُت بدلنا چاہیئے

قسمتوں پر بھی یقین اَچھا ہے، پر
کچھ رہِ تدبیر چلنا چاہیئے

آسمانوں کے سفر سے پیشتر
عزم کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے

کر کے منزل کا تعیّن ذوالفقار
تازہ دم ہو کر نکلنا چاہیئے

OO

درد سب رام کر دیے جائیں
پھر مرے نام کر دیے جائیں

اپنا پنچھی تلاش کرنا ہے
آشیاں دام کر دیے جائیں

پھر وہ گلشن کی سمت نکلا ہے
راستے جام کر دیے جائیں

دشت و صحرا سے جو بھی لائے تھے
ارمغاں، عام کر دیے جائیں

حاکمِ شہر کے سبھی قصے
طشت از بام کر دیے جائیں

قدر دانِ ہنر نہیں تو کیا
ہاتھ نیلام کر دیے جائیں؟

OO

کوزہ گر دیکھ اگر چاک پہ آنا ہے مجھے
پھر ترے ہاتھ سے ہر چاک سِلانا ہے مجھے

رات بھر دیکھتا آیا ہوں چراغوں کے نشاں
صبحِ عاشور سے اب آنکھ ملانا ہے مجھے

ہاتھ اُٹھے نہ کوئی اب کے دُعا کی خاطر
ایک دیوار پسِ دار اُٹھانا ہے مجھے

سر بچے یا نہ بچے تیرے زیاں خانے میں
اپنی دستار بہر طور بچانا ہے مجھے

چھوڑ آیا ہوں درِ دل پہ میں آنکھیں اپنی
اب ذرا جائے جو کہتا تھا کہ جانا ہے مجھے

باندھ رکھے ہیں مرے پاؤں میں گھنگرو کس نے
اپنی سُر تال پہ اب کس نے نچانا ہے مجھے

OO

بے زباں لفظ ہیں، شاعری ہے کہاں
درد و غم کی مرے بات کی ہے کہاں

دشت ہے، دھوپ ہے اور بے سائگی
پاؤں بھی شل ہیں، پر بے بسی ہے کہاں

بے مکاں بے نشاں، خاک میں خاک بس
میرا ملبوسِ تن خسروی ہے کہاں

میرا سوزِ دروں مائلِ لطف ہو
مجھ میں شعلہ فشاں وہ نمی ہے کہاں

پھونک دے بڑھ کے جو تیرگی کا بدن
میری آنکھوں میں وہ روشنی ہے کہاں

صوت و حرفِ تمنا سے ہو با خبر
ایسی ادراک میں نغمگی ہے کہاں

OO

عکس کوئی زندگی کا تیرے درپن میں نہیں
سبز رَو کوئی شجر اِس حجرۂ تن میں نہیں

یہ فسوں کاری چلے گی کب تلک یوں ناصحا!
کیوں زباں پر لا رہا ہے جو ترے من میں نہیں

جس کی شاخوں پر کوئی اُجڑا پرندہ آ بسے
وائے ایسا اک شجر بھی تیرے آنگن میں نہیں

ہر کسی پر تنگ ہیں کچھ اِس طرح ارض و سما
لگ رہا ہے رفتگاں بھی اپنے مدفن میں نہیں

سُونی سُونی ہیں خلائیں، دیکھ تا حدِ نظر
اور شاہیں بھی کوئی اپنے نشیمن میں نہیں

آپ بیتی کو جہاں بیتی بنا کر پیش کر
قافیہ پیمائی کی قیمت کوئی فن میں نہیں

OO

مجھے زمان و مکاں کی حدود میں مت رکھ
صدا و صوت کی اَندھی قیود میں مت رکھ

میں تیرے حرفِ دعا سے بھی ماورا ہوں میاں
مجھے تو اپنے سلام و درود میں مت رکھ

کلیم وقت کے در کو جبیں ترستی ہے
امیرِ شہر کے بیکل سجود میں مت رکھ

بچھا یقیں کا مصلیٰ درونِ ہستی میں
نیاز و راز کے قصے نمود میں مت رکھ

پسِ وجودِ جہاں میری خاک ہی تو ہے
رموزِ ہستیٔ دوراں ورود میں مت رکھ

نظامِ قیصر و کسریٰ کی میں روانی ہوں
وجوبِ عین ہوں صاحب، شہود میں مت رکھ

OO

اپنی نگارشات سے آگے کی سوچنا
حرف و بیان و بات سے آگے کی سوچنا

اُس کی عطاے فضل ہے ہر حد سے بھی پرے
تم بھی رہِ نجات سے آگے کی سوچنا

مہر و مہ و نجوم بھی ہو جائیں گے مطیع
بس اپنی کائنات سے آگے کی سوچنا

شیریں زبانیوں کا ہو جن میں کوئی عرق
ایسے مرکبات سے آگے کی سوچنا

بے چارگی کے سائے میں کچھ روز کا ہے کھیل
اِس عارضی حیات سے آگے کی سوچنا

فرصت سے مجھ کو دل میں بٹھا کرائے ذوالفقار
رسمی تعلقات سے آگے کی سوچنا

OO

بے مروت ہیں، تو واپس ہی اُٹھا لے شب و روز
مجھ کو بھاتے نہیں یہ تیرے نرالے شب و روز

ایک اُمّید کا تارا ہے سرِ بام ابھی
اُس کی کرنوں ہی سے ہم نے ہیں اُجالے شب و روز

جو تری یاد کے سائے میں گزارے ہم نے
ہیں وہی زیست کے انمول حوالے، شب و روز

دشت سے خاک اُٹھا لایا تھا اَجداد کی میں
گھر میں رکھّی تو ہوئے چاند کے ہالے شب و روز

دستِ خونیں نہ کبھی ہاتھ اُٹھائے تجھ پر
حکم لمحوں پہ چلا، ڈھال بنا لے شب و روز

اپنے دن رات سے ممکن ہے کہاں کوئی فرار
دشتِ وحشت میں اُتر اور سجا لے شب و روز

OO

مجھ سے نظریں نہ تُو چرایا کر
میرے گھر میں بھی آیا جایا کر

دیکھ کر تُو مرے تبسم کو
آسماں سر پہ مت اُٹھایا کر

جام و مینا سے جی نہیں بھرتا
اب سمندر مجھے پلایا کر

دل کی ٹیسوں سے جو نکلتا ہے
اُس دھویں سے نظر ملایا کر

آئینے ٹوٹ جائیں گے سارے
پتھروں کو نہ یوں سجایا کر

درد اچھے ہیں ذوالفقار میاں
راحتوں کو نہ منہ لگایا کر

OO

اپنے ہونے کا کبھی بھی جو گماں ہوتا تھا
خاک ہی خاک تھی یہ جسم کہاں ہوتا تھا

ایک منظر تھا، مگر دیکھتا کیسے کوئی
آنکھیں جلتی تھیں ہر اک سمت دھواں ہوتا تھا

عشق تھا، پر نہ مکاں تھا نہ مکیں، کچھ بھی نہیں
کوئی حاصل نہ محصل نہ زماں ہوتا تھا

جستجو وصل کی اِس موڑ پہ لے آئی مجھے
میں یہاں ہوتے ہوئے روز وہاں ہوتا تھا

کوئی امکان میں امکاں جو نظر آیا تو
اک تیقّن تھا کہ پھر نوحہ کناں ہوتا تھا

میں گرفتارِ غمِ ہجرِ بتاں تھا تب بھی
درمیاں کوئی نہاں تھا نہ عیاں ہوتا تھا

OO

اک کاغذی کشتی میں ہیں اَسوار نمک کے
کچھ دیر میں کھُل جائیں گے اَسرار نمک کے

کردار کے سانچے میں جوکوئی نہ ڈھلے تو
ملتے ہیں کہاں خون میں آثار نمک کے

زخموں کی کوئی وقت پہ مرہم نہ کرے تو
ہو جاتے ہیں پھر خود یہ طلبگار نمک کے

ہلکا سا نمک ہے جو مرے اِشکِ رواں میں
بہہ جائیں گے اِس میں ترے انبار نمک کے

کیا کوئی نہیں شہر میں مرہم کی دُکان اب؟
ہر سمت سجے ہیں یہاں بازار نمک کے

اک بول بھی میٹھا نہیں سننے کو میسر
کھاری ہے ہر اک سوچ، ہیں افکار نمک کے

OO

وہ ریا کار ہے تو ہونے دو
اور عیار ہے تو ہونے دو

خود اُٹھائی ہیں اُس نے دیواریں
اب گرفتار ہے تو ہونے دو

سر سنبھالا نہیں گیا اُس سے
اب سرِ دار ہے تو ہونے دو

بغض کا پیڑ خود لگایا تھا
اب ثمر دار ہے تو ہونے دو

وقت کی آنکھ پھوڑ پاؤ گے؟
آئینہ دار ہے تو ہونے دو

وقت نے سب کی کھول دیں گرہیں
وہ طرح دار ہے تو ہونے دو

OO

آگہی کا لگ گیا آزار تھا
رزم ہو یا بزم، وہ تلوار تھا

کرچیاں چنتا رہا میں سارا دن
شب ہوئی تو آئینہ بے کار تھا

حسن کو محتاجِ زیور دیکھ کر
قیس اچھا ہو گیا، بیمار تھا

کیسے کرتا ہاتھ پر بیعت مرے
وہ یزیدی فوج کا سالار تھا

اُس نے چن چن کر مکاں توڑے سبھی
جو ہمارے شہر کا معمار تھا

بِک گیا خود ہی دیارِ غیر میں
جو ترے بازار کا شہکار تھا

OO

وہ جو ایک ہُو سا بہاؤ تھا
مری خاک ہی کا الاؤ تھا

جسے قلب کہتا تھا شور و شین
مری آگہی کا سبھاؤ تھا

وہ خریدتا کسے بیچ کر
مرا جسم تو نِرا گھاؤ تھا

مری خاک تُو تو نہ روندتی
ترے علم میں مرا بھاؤ تھا

کبھی بھول کر یہ جھکا تھا سر
کبھی بے بسی کا دباؤ تھا

مرے جسم پر تری خاک تھی
جبھی اپنی سمت جھکاؤ تھا

OO

بہت ہے تیز دریا کا بہاؤ
میاں گھر فاصلے پر ہی بناؤ

اگرچہ زندگی کی ہے علامت
مگر تم دل میں دریا مت بساؤ

قیامت خیزیاں دکھلا رہا ہے
نہایت مختصر سا اِک پڑاؤ

مرے ہاتھوں میں ہے تحریر سب کچھ
ذرا دستِ رفاقت تو بڑھاؤ

تفاوت اصل میں کچھ بھی نہیں ہے
اَنا کا آنکھ سے پردہ اُٹھاؤ

مکمل دشت ہوتا جا رہا ہوں
مرے صحرا میں بھی رستہ بناؤ

OO

فصلِ غم پر پھر بہار آنے کو ہے
میرے حصے میں فشار آنے کو ہے

تیشۂ آزر سے لپٹا ہوں ابھی
زندگی خود مستعار آنے کو ہے

ہوں وجودِ ہست میں اُلجھا ہوا
نیستی تجھ کو قرار آنے کو ہے

آسماں کی آنکھ میں پیوست ہوں
خاک میں میری شرار آنے کو ہے

جس کے تیور ہُو بہُو تیرے ہی ہیں
ہمنوا ایسا سوار آنے کو ہے

موج اِک طوفاں سے اُٹھ کر ذوالفقار
تجھ کو ساحل پر اُتار آنے کو ہے

OO

وہ غیرتوں کے پانیوں میں زندگی گنوا گیا
لُٹا جو بستیوں میں تھا، وہ دشت کو بسا گیا

وہ اک صدائے بے صدا، کسی کو یاد تک نہیں
جو کرچیوں میں بانٹ کر، وہ شہر کو سُنا گیا

ہر ایک منہ چھپا رہا تھا بے بسی کی اوٹ میں
وہ چور چور ہو کے بھی یوں آئینہ دکھا گیا

یہ خاک و خوں کا ایک گھر جسے ہیں پوجتے سبھی
وہ خود سری کے شوق میں اِک آن میں جلا گیا

گری ہیں اِس پہ بجلیاں، اُٹھی ہیں اِس میں آندھیاں
جو شہرِ نا مراد میرے نام وہ کرا گیا

وہ رات دن لگا ہوا ہے روزنوں کی تاک میں
چراغِ خانۂ دلم جو شخص تھا بجھا گیا

OO

سایۂ دستِ دوستاں ہے تُو
یا کسی غم کا سائباں ہے تُو

گرمیٔ لمسِ یادِ بے خود ہے
یا کہ سوزِ دلِ تپاں ہے تُو

عکس اُترا نہ پورا آنکھوں میں
ہو کے ظاہر بھی یوں نہاں ہے تُو

تیری خوشبو ہے ہمسفر کب سے
ساتھ میرے مگر کہاں ہے تُو

وصل اِمکاں میں کس طرح آئے
میں زمیں اور آسماں ہے تُو

میرے ایقاں پہ حرف آتا ہے
کیسے کہہ دوں کہ اِک گماں ہے تُو

OO

مرے سر پہ ہاتھ رکھنا جو ترا شِعار ہوتا
میں نہ در بدر بھٹکتا کہیں آر پار ہوتا

مری خاک میں وِلا کا نہ کوئی شرار ہوتا
نہ ہی دل سے آگ اُٹھتی، نہ یہ بے قرار ہوتا

میں رہینِ قلبِ مضطر، تُو چراغِ شادمانی
تری محفلِ طرب میں کہاں دلفگار ہوتا

کسی کام کا نہ چھوڑا، تری بے خودی نے اے دل
تری بات ٹال دیتا تو نہ خود پہ بار ہوتا

ترے حُسن کی کہانی مری چشمِ تر سے نکلی
میں نہ اشکبار ہوتا، تو نہ آشکار ہوتا

اگر اِس پہ بیٹھ جاتا کوئی مرغِ نا اُمیدی
مرا نخلِ آرزو پھر کہاں سایہ دار ہوتا

OO

صحرا اُتارنا ہے یا کوثر، اُتار دے
جیسا بھی ہے نصیب کا اختر اُتار دے

بھائے نہ اِس کو رنگِ دگر حشر تک کوئی
اِک ایسا میری آنکھ میں منظر اُتار دے

بھاتی ہے مجھ کو بس اُسی در کی گداگری
مجھ کو مرے حبیبؑ کے در پر اُتار دے

دھندلا نہ جائے عکسِ رُخِ دلربائے من
اِک طُور میری آنکھ میں یکسر اُتار دے

صدیوں کی پیاس ہے مرے اندر بسی ہوئی
لا ساقیا! دہن میں سمندر اُتار دے

خطرے میں پھر ہے کعبۂ ایمانِ ذوالفقارؔ
یا رب کوئی پرند کا لشکر اُتار دے

OO

دیا کہتے کہتے، ہَوا کہتے کہتے
وہ ہنستا رہا ماجرا کہتے کہتے

اگر لَوٹ آیا تو پوچھیں گے ہم بھی
سمندر میں اُترا، وہ کیا کہتے کہتے

زَ مغرب تا مشرق جفا کاریاں ہیں
ہر اک آنکھ نم کربلا کہتے کہتے

تھا معلوم کس کو، وہ نکلے گا پتھر
جسے ہم نے پوجا خدا کہتے کہتے

چراغوں کی ہے روشنی مشتعل اَب
ہَوا سے ہے لپکی وغا کہتے کہتے

شب و روز سہلاتا ہوں آبلوں کو
میں صحرا کو دشتِ دوا کہتے کہتے

OO

جس کو حاصل تری تائید نہیں
کچھ بھی ہو صاحبِ تقلید نہیں

کیا کوئی تازہ ہوا گزری ہے
بُلبل و گُل کوئی نومید نہیں

ذرّے ذرّے میں نظر آئے تُو
کیسے کہہ دوں کہ ہوئی دید نہیں

اَیرے غیرے سے تعلق ہے ترا
گھر کے رشتوں کی پہ تجدید نہیں

حق بیانی کا فقط ڈھونگ ہے یہ
ظلم کی کوئی بھی تردید نہیں

ایک جگنو کی تمنا ہے فقط
ہم نے مانگا کوئی خورشید نہیں

OO

ہوش جب اُس کا ٹھکانے لگ گیا
حرفِ لا سب کو پڑھانے لگ گیا

ہاتھ کیا میں نے بڑھایا اُس طرف
وہ مجھے اپنا بنانے لگ گیا

پھر ہوا کے دوش پر ہیں تلخیاں
پھر یہ موسم آزمانے لگ گیا

ایسا چمکا وہ چراغِ آرزو
آنکھوں کی پتلی جلانے لگ گیا

وہ مری مٹی میں پنپا اِس طرح
میرے اندر گھر بنانے لگ گیا

احتراماً کیا اُٹھا میں، ذوالفقار!
رنگ وہ اپنا دکھانے لگ گیا

OO

نفس نفس کا بروزِ محشر شمار ہو گا، حساب ہوگا
کسی کی نغمہ سرائی ہو گی، نہ کوئی چنگ و رباب ہو گا

تری نظر میں جو بے کلی ہے، وہی ہے اصلِ حیات، ناداں
تجھے بھی ادراک ہو گا اک دن، ضرور ہو گا، شتاب ہو گا

گلی میں اُس کی قدم قدم پر، ہیں سایہ افگن سِناں و خنجر
مگر وہ ایسی بھی دل لگی کیا، نہ جس کا ایسا نصاب ہو گا

بناتا رہتا ہوں جو گھروندے، سجا کے رکھتا ہوں جن کو دل میں
اُنھیں گراتا ہے کون آخر، کوئی تو اِس کا جواب ہو گا

یہ راز کب تک چھپا رہے گا، پکار اُٹھیں گے دشت سارے
رقم جو ہوں گی یہ داستانیں، تو ذرّہ ذرّہ کتاب ہو گا

خراب حالوں کے اِس نگر میں، یقین ہے ذوالفقار مجھ کو
کھِلیں گے وصلت کے پھول ہر سُو، ہر ایک چہرہ گلاب ہو گا

OO

کیسے کہہ دوں اِدھر نہیں آتا
روز آتا ہے پر نہیں آتا

غیر ممکن نہیں مسیحائی
پر، کوئی چارہ گر نہیں آتا

ہم بھی باہر نکل نہیں سکتے
وہ پرندہ بھی گھر نہیں آتا

عمر بھر ہم نے آبیاری کی
شاخِ دل پر ثمر نہیں آتا

سچ بھی چلتا نہیں زمانے میں
جھوٹ کا بھی ہنر نہیں آتا

ہمسفر کیوں تجھے کوئی آخر
درد میرا نظر نہیں آتا

ذوالفقارِ علی، تری رہ میں
کیوں کوئی بھی شجر نہیں آتا

OO

یہ صحرا کیوں مجھے اُلجھا رہا ہے
مرے قبضے میں تو دریا رہا ہے

اگر برسا تو لے ڈوبے گا سب کو
جو بادل پیاس کا منڈلا رہا ہے

خرد آشفتگی کے نام کر دی
کہ یہ سودا بہت مہنگا رہا ہے

بجھا آیا تھا اشکوں سے جسے میں
کوئی وہ آگ پھر بھڑکا رہا ہے

بہا لے جائے گا اس کو بھی دریا
جو ٹیلہ ریت کا اِترا رہا ہے

عجب غم ہے کہ آ جاتا ہے واپس
مگر ہر بار منہ کی کھا رہا ہے

مری منزل سے اُس کو کیا تعلق
مجھے رستے سے جو بھٹکا رہا ہے

OO

تم جو چھالوں کی بات کرتے ہو
کیوں ہمالوں کی بات کرتے ہو؟

کس کے ہاتھوں میں تھا نہیں پتھر
شام والوں کی بات کرتے ہو؟

اپنے چہرے پہ پوت کر کالک
تم اُجالوں کی بات کرتے ہو!

خشک روٹی تو دے نہیں سکتے
تَر نوالوں کی بات کرتے ہو

جو نمک ہیں ہمارے زخموں پر
اُن حوالوں کی بات کرتے ہو!

چھین کر ہم سے جرأتِ اظہار
اب سوالوں کی بات کرتے ہو

جسم جن کے ہیں بوجھ روحوں پر
اُن جیالوں کی بات کرتے ہو؟

OO

مات کھا کر دیکھنا پچھتائے گی
جو بھی مشکل عزم سے ٹکرائے گی

غرب سے اُٹھی ہے پھر کوئی ہوا
تیرے بام و در اُڑا لے جائے گی

پھر سَروں کی فصل کا امکان ہے
خوں سے شہر و دشت کو مہکائے گی

فیصلہ تقدیر پر چھوڑا تو یہ
بیڑیاں تدبیر کو پہنائے گی

اُٹھ رہی ہیں دل سے پھر چنگاریاں
ظلم کی ہر اک دکاں جل جائے گی

آتے جاتے ہاتھ خالی ہیں ترے
زندگی کس شۓ پہ تُو اِترائے گی

تُو مسافر، بے نوا ہے ذوالفقارؔ
کون سی بستی تجھے اپنائے گی

OO

حسن سے تیرے کشیدیں گی سہارا کتنا
اِن بجھی آنکھوں سے ہوگا بھی گزارا کتنا

رنگ بھر لائے ہو تصویر میں اتنے لیکن
اِس میں احساس کی نگری کا ہے گارا کتنا

سر پہ ہر روز نئی اینٹ ہے لادی جاتی
تُونے اے یار مرا بوجھ اُتارا کتنا

شہر تو روز چلی جاتی ہے غازہ مل کر
جانِ من میرے لیے خود کو سنوارا کتنا

ڈوبنے والے نے موجوں سے یہی پوچھا بس
یہ بتا دو کہ ہے اب دور کنارا کتنا

مسئلہ اتنا بڑا تو نہیں تھا پر کچھ لوگ
میرے دشمن سے ملے اور اُبھارا کتنا

ہو نہیں سکتی کسی طور یہ دنیا تیری
دیکھ پھر بھی ہے تجھے زعم یہ پیارا کتنا

OO

ہے دور بہت دور پہ جانا ہی پڑے گا
افلاک سے تارا کوئی لانا ہی پڑے گا

ممکن ہے کہاں تیرے شکنجے سے مفر اب
اے وقت ترا ساتھ نبھانا ہی پڑے گا

یہ تیرہ شبی راستہ دے گی نہ کسی طور
سورج کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی پڑے گا

پہلو میں ترے بیٹھ کے ہم سوچ رہے ہیں
اے دہر تجھے چھوڑ کے جانا ہی پڑے گا

اے زیست! مرے سر سے اُتر جا تُو کسی روز
ورنہ تجھے مجرے میں نچانا ہی پڑے گا

اے بادہ کشو، بھول گیا ہے تمھیں ساقی
پینا ہے تو پھر اُس کو منانا ہی پڑے گا

یہ ریگِ تپاں، دشت، یہ بے سایگی اتنی
اِس جسم کو اَب پیڑ بنانا ہی پڑے گا

OO

خاک زادوں کے لیے خاک تھی خالی، دنیا
وجد میں آئے تو ہاتھوں میں اُٹھا لی دنیا

ہم فقیروں کو زمانے کی تب و تاب سے کیا
ہم جہاں بیٹھ گئے اپنی بنا لی دنیا

کیا میسر ہے اُنھیں، پوچھو، درونِ خانہ
وہ جو کہتے تھے کہ ہم نے ہے، کما لی دنیا

اِن دنوں ہم نے تو جھڑتے ہوئے پتے دیکھے
تم تو کہتے تھے کہ ہے سبز، جمالی دنیا

تیری یادوں کے دریچوں سے جو آتی تھی کرن
اُس کے سائے میں رُکے، بیٹھے، اُجالی دنیا

اِک طرح ٹھیک ہوا تم کو دکھا دی اوقات
تم نے اغیار کے در پر تھی بسا لی دنیا

جدِ امجد کی ہے مطلوقہ اِسے کیا کرتے
ہم نے منہ پھیر لیا اور نبھا لی دنیا

OO

اُبھر رہا ہے جو کردار اب کہانی میں
کہاں تھا شائبہ اِس کا کسی نشانی میں

اُسے یقین کی منزل پہ لے ہی آیا ہوں
دکھائی دیتی ہے اب اس کو آگ پانی میں

تمھارے ہوتے ہوئے لٹ گئی متاعِ جاں
کمی کوئی تو رہی ہو گی پاسبانی میں

صدا فقیر کی در سے ترے جو لوٹی ہے
یہی لگائے گی اب آگ حکمرانی میں

جھکا ہے عالمِ پیری میں سر تو کیا حاصل
خدا سے لَو نہ لگائی اگر جوانی میں

یہ اہتمام ہے سارا فقط تری خاطر
سبھی ہیں آئے ہوئے تیری پیش خوانی میں

ہر ایک حرف سے ہوتی ہے بات مدت تک
میں ڈوب جاتا ہوں جب قلزمِ معانی میں

OO

سرِ محفل بہت بولا نہ جائے
کوئی شکوہ لبوں تک آ نہ جائے

شجر کو کاٹنے والی ہے بستی
پرندہ بے خبر مارا نہ جائے

الٰہی بھیج دے پھر کوئی ہادی
روا جو ظلم ہے، دیکھا نہ جائے

دلِ بے کیف آہستہ سسکنا
کہیں اب کے تُو پھر پکڑا نہ جائے

عبث ہے زندگی جس میں کبھی بھی
برائے دیگراں سوچا نہ جائے

بہت چالاک ہیں بچے، مبارک
بزرگوں کو مگر ٹوکا نہ جائے

وہاں رہتی نہیں خوشیاں کوئی پل
جہاں آپس میں غم بانٹا نہ جائے

OO

مری مٹی پرانی ہو گئی ہے
عدم کی اک نشانی ہو گئی ہے

کوئی پھر چاک پر رکھ دے یہ مٹی
بکھر کر لامکانی ہو گئی ہے

سرِ دشتِ جنوں اُگتی سیاہی
متاعِ زندگانی ہو گئی ہے

اُبھر آئے نہ جانے کب سمندر
تمنا پانی پانی ہو گئی ہے

تمھارے شہر میں کشکول خالی
یہاں اتنی گرانی ہو گئی ہے!

نکل آیا ہوں پتھر کے جگر سے
خدا کی مہربانی ہو گئی ہے

نیے منظر، نئے کردار لاؤ
بڑی بوگس کہانی ہو گئی ہے

OO

خاموش زمزمے ہیں، مرا حرفِ زار چپ
ہر اختیار چپ ہے، ہر اک اعتبار چپ

بادِ سموم در پئے آزار دیکھ کر
سکتے میں بے قرار ہے بادِ بہار، چپ

منظر نہیں ہیں بولتے، صحرا اُداس ہے
پتھرا گئی ہیں آنکھیں، دلِ داغ دار چپ

جو کچھ بھی ہو رہا ہے، یہ مقسوم تو نہیں
بس تجھ کو کھا گئی ہے تری سوگوار چپ

ہر ایک کو ہوں گوش بر آواز دیکھتا
اوڑھے ہوئے ہوں جب سے میں اِک باوقار چپ

حرفِ دعا نہ دستِ طلب، در پہ آن کر
لب پر فقط ہے رقص میں اک دلفگار چپ

سر چڑھ کے ظلم بول رہا ہے جہان میں
بہرِ خدا اَب توڑ دو اے ذوالفقار چُپ

OO

جوجھتا رہتا ہوں میں وقت کی پرخاشوں سے
خوف آتا نہیں اب ظلم سے، پاداشوں سے

سر ہتھیلی پہ لیے گھر سے نکلتے ہیں سبھی
کون بچتا ہے ترے شہر کے اوباشوں سے

ختَم اللّٰہ کا مصداق ہے سینہ اُس کا
بڑھ رہی ہے یہ سیاہی تری شاباشوں سے

کوئی میرا ہو کہ تیرا ہو، اُسے کیا لینا
وہ بلا خوف گزرتا ہے پڑی لاشوں سے

اب کے سفّاکی تازہ سے بنے گا نقشہ
سُن کے آیا ہوں ابھی شہر کے نقاشوں سے

کس نے لُوٹا ہے ترے گھر کو ، تری بستی کو
پوچھتے کیسے سوالات ہو عیّاشوں سے

اب تلک ہم نے مکمل نہیں پایا کچھ بھی
زندگی کتنی کشیدیں گے بھلا قاشوں سے

OO

ٹمٹماتا سا اک دِیا تنہا
جل رہا تھا، بجھا، جلا تنہا

میں جو تنہائی سے ملا تنہا
خود سے خود ہی لپٹ گیا تنہا

تیرے سورج کی فرطِ حدت سے
تیرگی ہی میں ہوں بھلا تنہا

اب پرندے بھی کب ہیں شاخوں پر
رات کٹتی ہے با خدا تنہا

وقت کی سورما ہواؤں سے
کس نے مجھ کو لڑا دیا تنہا

چھاؤں تیری ہے، دھوپ بس میری
اپنی رہ پر ہوں چل رہا تنہا

لوٹ آؤ اے ذوالفقار میاں
گھر ہے کب سے پڑا ہوا تنہا

OO

رُکی ہوئی ہیں ہوائیں جیسے، میں روز جیتا ہوں روز مر کے
فضا میں رقصاں ہے ہُو کا عالم، ہر ایک بیٹھا ہے گھر میں ڈر کے

نہ کوئی ساتھی نہ کوئی دشمن نہ کوئی رشتہ نہ کچھ تعلق
یہ بام و در بھی ہیں روٹھے روٹھے، نہ دیکھیں دیواریں آنکھ بھر کے

سبھی کو جاں کے پڑے ہیں لالے، ڈھکا ہوا ہے ہر اک نے چہرہ
ہر ایک رہ پر سکوت طاری، عجب مناظر ہیں رہگزر کے

ڈگر ڈگر میں، زمیں فلک میں، مری نظر نے جسے تلاشا
درونِ خانۂ دل چھپا تھا، میں جس کو بیٹھا تھا دور کر کے

فضول شکوے، عبث شکایت، ثمر ہے اپنے کیے کا سارا
حضورِ حق میں جھکے جو ہوتے، نہ کھاتے دھکے ہر ایک در کے

شعور و فکر و عمل سے خالی، بجز ندامت کے پاس ہے کیا ؟
نہ منزلوں کی خبر ہے کوئی، نشاں نہیں کوئی رہ گزر کے

سریر و تاج و غنا پہ جن کو، غرور تھا، ہیں اسیر گھر میں
سیاہ شب ہے حیات ان کی، ہیں منتظر یہ سبھی سحر کے

OO

ہر گام پر ملیں گے فنکارِ آگہی
پر کون جانتا ہے اَسرارِ آگہی

ویراں پڑے ہوئے ہیں سارے کتاب گھر
جب سے بنا ہے گوگل بازارِ آگہی

اِنکار بھی غلط ہے اِقرار بھی غلط
پھر کون طے کرے گا معیارِ آگہی

تدبیر بے ثمر ہے، تقدیر بے زباں
جائے کدھر بتایئے بیمارِ آگہی

کیسے خموش بیٹھوں، کب تک رہوں میں چپ
سر پر لٹک رہی ہے تلوارِ آگہی

قرآں میں کر تفکر، بے شک وہی تو ہے
شہکارِ آگہی اور گلزارِ آگہی

وہ جیتے جی ہے مردہ دنیا میں، ذوالفقار
جس کو نہیں لگا ہے آزارِ آگہی

OO

تشنگی، فقر و فاقہ، عنایات ہیں، بے بسی اوڑھ لے، غم کی دولت نہ بیچ
چار دن کا ہے قصہ یہ رعنائیاں، دشت سے جو ملی ہے وہ شہرت نہ بیچ

ہوش کر ناصحا! مستقل ،دور تک، خود نمائی ،تعصب نہ چل پائیں گے
چھوڑ دے اَب پہننا یہ سب عینکیں، اپنے اَسلاف کی تُو بصیرت نہ بیچ

ہمسری کوئی کیسے کرے گا تری، تو ملائک کا مسجود بھی رہ چکا
پر، وہ خودداریاں کیا ہوئیں آجکل، چند سِکّوں کے بدلے میں عظمت نہ بیچ

ظلم و جور و جفا ،بس ریا کاریاں، ہر قدم پر سہولت سے مل جائیں گے
لا تصرف میں اِن کو نہ تو اے اخی، حق نمائی پہ مر، یوں صداقت نہ بیچ

ہر طرف وحشتیں اور خوں ریزیاں، وقت کے اِن یزیدوں کی چالیں ہیں سب
وارثِ ابنِ حیدرؑ ہے، غازی ہے تُو، غیرِ فرّار ہے عزم و ہمت نہ بیچ

تیرگی سے نکلنے کی تدبیر کر، خود ہی سورج اُتر آئے گا بام پر
آگہی، روشنی، سروری، رہبری، تیری جاگیر ہیں، بس قیادت نہ بیچ

کون کہتا ہے حالات اچھے ہوئے، اَبتری چڑھ کے سر بولتی ہے میاں
پھر بھی مایوسیوں کو نہ منہ تُو لگا، ذوالفقارِ علی اپنی شوکت نہ بیچ

OO

پالے ہوئے ہیں دل میں جو ارمان وغیرہ
لاتے ہیں یہی زیست میں طوفان وغیرہ

رکھتا نہیں ہوں اِس لیے اے یار مقفل
گھر میں نہیں میرے کوئی سامان وغیرہ

کچھ بھولنا چاہا بھی مگر بھول نہ پایا
آیا نہیں کچھ کام یہ نسیان وغیرہ

اب شہر میں اُچھلے گی نہ دستار کسی کی
کیا ایسا ہوا ہے کوئی اعلان وغیرہ؟

مدحوش ہوں، سرشار ہوں، لاچار ہوں لیکن
بکتا نہیں اِس نشّے میں ہزیان وغیرہ

ہر سمت درندوں پہ ہی پڑتی ہے نظر اب
کیا کوئی نہیں شہر میں انسان وغیرہ

وہ امن و اماں کے جو صحیفے تھے، کہاں ہیں
ویران ہیں کیوں آج یہ جُزدان وغیرہ

OO

طوفان پہ طوفان ہی آتے ہیں مسلسل
ہر سمت زمانے میں مچی کیسی یہ ہلچل

اِس کار گہِ زیست پہ منڈلا رہی ہے موت
اَنفاس کی یہ ڈور بھی ٹوٹے نہ کسی پل

جو رونقِ بازار تھا گھر میں ہے مقید
تنہائی کی زینت ہے جو انسان تھا سوشل

آشفتہ سری اپنی بچائی نہیں جاتی
اِس شہر کے ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں پاگل

یہ شہرِ مکافات ہے، بویا ہوا کاٹو
جو جائے اَماں تھی، ہے وباؤں کی وہ دلدل

اِس شہر میں ساماں نہیں جینے کا میسر
ہر سمت ہواؤں میں ہے بس، زہرِ ہلاہل

بس بیٹھ کے خلوت میں پیے جاؤ ذوالفقارؔ
لبریز ہے اب رنج سے ہر ساغر و بوتل

OO

اَب کیسے چلے کوئی بھلا آبِ رواں پر
کیا وقت مصیبت ہے ہر اک خورد و کلاں پر

اَب اپنے تصرف میں ہَوا بھی نہیں باقی
یہ کیسا ہوا حال کہ بن آئی ہے جاں پر

اِس کار گہِ زیست کی ہر شے ہے تھمی سی
اے میرے خدا، پھونک دے پھر روح جہاں پر

اِس دہر کی بے رونقی کھاتی ہے کلیجہ
اَب اپنی نظر ہے تو فقط کوے بتاں پر

اَب کوئی معالج نہ میسر ہے دوائی
جو درد نکل آیا ہے لے جائیں کہاں پر

اِک زخم یہ ہلکا سا سنبھلنے نہیں دیتا
کیا ہو گا اگر ہوں گے کئی تیر کماں پر

مغرور تھے ،جوخود کو خدا مان رہے تھے
محصور ہیں، فریاد ہے اَب اُن کی زباں پر

OO

یہ کیسا ماجرا ہونے لگا ہے
کہ اَب غم بھی خفا ہونے لگا ہے

مجھے اِس شوق میں اُلجھا یئے مت
مرا سجدہ قضا ہونے لگا ہے

بہت محتاط ہوتا جا رہا ہوں
مرا بچہ بڑا ہونے لگا ہے

دلِ نادان کی دیکھو بغاوت
کہ اب میرا خدا ہونے لگا ہے

وہی ہے اصل میں وجہِ علالت
جو زخموں کی دوا ہونے لگا ہے

تحیر ہے، تحیر چاروں جانب
نہ اب تک جو ہوا ہونے لگا ہے

فلک نے کیا نگل ڈالے ستارے؟
اندھیرا کیوں گھنا ہونے لگا ہے

OO

گورے، کالے کاٹ رہے ہیں
کیوں سب چہرے کاٹ رہے ہیں

کتنا ظالم ہوگا منظر
جس کے نقشے کاٹ رہے ہیں

جس سے پوچھا، جس سے جانا
بولا، رشتے کاٹ رہے ہیں

بام و در دیواریں کاٹیں
آنگن، رستے کاٹ رہے ہیں

جن کو سُر میں ڈھالا ہم نے
اب وہ نغمے کاٹ رہے ہیں

صحرا صحرا آگ کا دریا
ہر پل ذرّے کاٹ رہے ہیں

گہری جھیل کا میں اِک پتھر
پھر بھی شعلے کاٹ رہے ہیں

OO

مجھ سے نہ مجھے چھین، نہ اِس طرح جدا کر
اے میرے بھرم دیکھ، مرے پاس رہا کر

اے بادِ صبا بھول کے آئی نہ اِدھر تُو
پژمردہ جو کلیاں ہیں کبھی اُن سے مِلا کر

سیراب اگر تجھ سے نہیں ہوتا یہ صحرا
اِترا کے مرے پاس سے ایسے نہ بہا کر

بے لوث محبت کے جنازے میں تو آؤ
میں کیسے چلوں لاش اکیلے ہی اُٹھا کر

گذرا ہوں گھٹا ٹوپ اندھیروں سے بِلا خوف
اکثر تری یادوں کے چراغوں کو جلا کر

اِس خاک سے اُبھریں گے نئے چہرے یقیناً
اِس خاک میں آیا ہوں کئی چہرے ملا کر

اِس شہر میں، سنتا ہوں کہ آزر ہیں بہت سے
لا دے گا مجھے کون مرا چہرا بنا کر

OO

تمام عمر ہی گردِ رہِ سفر میں رہا
مجھے ملی کوئی منزل نہ اپنے گھر میں رہا

کبھی خیال نہ آیا کہ لوٹنا بھی ہے
کچھ اِس طرح کسی خوشبو کے میں اَثر میں رہا

گراتا کیسے نظر سے جہاں، کہ میں ہر دم
کسی نگاہِ مکرم کی ہی سپر میں رہا

کچھ اِس طرح ہوا مانوس اُس کی مٹی سے
ڈگر ڈگر میں اُسی دشت کی نظر میں رہا

وہ حرف حرف مجھے ڈھونڈتا عبارت میں
میں صوت صوت کسی شعلہ و شرر میں رہا

جتن ہزار کیے، رات دن پرستش کی
مگر نصیب کا پتھر تھا رہ گزر میں رہا

شکارِ فطرتِ آشفتگی ازل سے ہوں
نہ چاک پر نہ کبھی دستِ کوزہ گر میں رہا

OO

عطا چاک نے جو کیا پیرہن ہے
سُوے خاک پھر وہ ہوا گامزن ہے

میں رکھتا نہیں بال و پر کچھ بھی لیکن
کہاں کوئی قیدِ مکان و زمن ہے!

تکلّم پہ مائل ہیں دیوار و در بھی
پہ لب پر مرے خامشی موجزن ہے

تقاضاے رختِ سفر مت کرو اَب
ہر اک راہبر ہو گیا راہزن ہے

نہ برسی کوئی وصل کی بوند اَب تک
جدائی کے شعلوں نے گھیرا بدن ہے

کوئی اِس طرف سے یقیناً ہے گزرا
کہ سارا چمن شبنم و نسترن ہے

اُگایا تھا ہم نے جو ہاتھوں پہ سورج
وہ اَقلیمِ فن پر ہوا ضو فگن ہے

OO

اے خودی تیری نوکری کر کے
ہم دھنی ہو گئے مقدر کے

کوئی دستار تک نہ آ پایا
میرے دشمن نہ تھے برابر کے

العطش کی صدائیں ہیں لب پر
پاس گرچہ ہوں اِک سمندر کے

شہر میں کوئی بھی نہیں آزر
کون اِنساں بنائے پتھر کے

رنگ ہم بھی کشید لائے ہیں
ہم بھی مرہون ہیں گلِ تر کے

مر کے جینا ابھی نہیں آیا
روز جیتے، مگر ہیں مر مر کے

ہم سے پوچھو غمِ مسیحائی
ہم شناسا ہیں اِس ستمگر کے

OO

صنم کو آزمانا چاہتا ہوں
میں پتھر میں ٹھکانا چاہتا ہوں

نہیں بھاتی یہ انسانوں کی دنیا
کوئی جنگل بسانا چاہتا ہوں

مرے چاروں طرف لاشیں پڑی ہیں
یہ دل پتھر بنانا چاہتا ہوں

چمن میں چار سو ہے آگ لپکی
میں اشکوں سے بجھانا چاہتا ہوں

ابھی لاتقنطوا پر ہے تیقّن
ابھی کچھ دور جانا چاہتا ہوں

بہل جائیں یہ دل مغموم جس سے
میں وہ نغمہ سُنانا چاہتا ہوں

ابھی اِس خاک میں کچھ تازگی ہے
میں اِس کو بھی جلانا چاہتا ہوں

OO

تُو نے میرے اشعار میں جدّت نہیں دیکھی
دیکھا کیے ہو فن ہی پہ حیرت نہیں دیکھی

جس وقت بھی تقدیر کی کھڑکی سے میں جھانکا
سوئی ہوئی اپنی کبھی قسمت نہیں دیکھی

آیا تجھے ہر رنگ نظر آنکھوں میں میری
جو دید کے قابل تھی وہ وحشت نہیں دیکھی

دیکھا ہے ہر اک ہاتھ میں بس زہرِ ہلاہل
پر زیست کی بٹتی ہوئی دولت نہیں دیکھی

پتھر بھی پگھل جاتے ہیں اِس آگ میں یکسر
تو نے مرے جذبات کی حِدّت نہیں دیکھی

جو وقت کا آلہ بنے پھرتے ہیں جہاں میں
اُن لوگوں کی میں نے کوئی عزت نہیں دیکھی

کیا ہے مرے کشکول میں تجھ کو نہیں معلوم
تُو نے مرے مالک کی عنایت نہیں دیکھی

OO

پیر و جواں کے رُخ پہ ہے ناکامیوں کا راج
کیا لَوٹ آیا شہر میں اَب رانیوں کا راج

بے رہ روی کا چلتا ہے سکّہ جہان میں
ہر سمت دیکھتا ہوں میں گمراہیوں کا راج

مسند نشیں ہیں دہر میں کذاب ہر طرف
مفقود ہے جہان سے سچائیوں کا راج

بزمِ طرب سجی ہوئی رہتی تھی صبح و شام
اب کیا ہوا کہ دل پہ ہے تنہائیوں کا راج

لاتقنطوا کا وِرد بھی اَب کام کا نہیں
نادار و مفلسوں پہ ہے مایوسیوں کا راج

تدبیر سے جو تیرا علاقہ نہیں رہا
لازم ہے تجھ پہ بے سر و سامانیوں کا راج

گر مشکلوں سے کھیلنا آیا نہ ذوالفقارؔ
ہوگا نہ زیست پر کبھی آسانیوں کا راج

OO

کہاں اپنے لیے کچھ کر رہے ہیں
ہم اوروں کے لیے ہی مر رہے ہیں

سلیقہ جن کو چلنے کا نہیں ہے
قیادت کا مری دم بھر رہے ہیں

جسے رکھّے خدا، پھر کون مارے
عجب ہیں لوگ، یوں ہی ڈر رہے ہیں

کوئی بھی جرم ثابت ہو نہ پایا
مگر الزام اپنے سَر رہے ہیں

پتہ جو بھول بیٹھے ہیں خدا کا
درِ اغیار پر سر دھر رہے ہیں

کوئی پوچھے اُنھیں، پردیس کیا ہے
گھروں سے اپنے جو باہر رہے ہیں

بہت اونچی اُڑانیں تھیں ہماری
کہاں پہلے سے لیکن پر رہے ہیں

OO

کیا عجب لوگ ہیں کھوٹے کو کھرا کہتے ہیں
ہر لُٹیرے کو یہاں راہ نما کہتے ہیں

ہم جنوں والوں کو لگتا ہے جو سامانِ طرب
جانے کیوں اہلِ خرد اُس کو سزا کہتے ہیں

اور کوئی بھی سبق یاد نہیں رہتا ہے
اُن کی تصویر نے ہم سے جو کہا کہتے ہیں

کوئی مظلوم دکھائی نہیں دیتا اِن کو
وقت کے سارے یزیدوں کو خدا کہتے ہیں

خاک میں خاک اُڑاتے ہوئے آئے ہیں اِدھر
روندتے جائیں گے یہ دشتِ بلا، کہتے ہیں

بے بصیرت ہیں پہ لگتا ہے بصارت بھی گئی
دیکھ کر زہرِ ہلاہل کو دوا کہتے ہیں

بس اسی واسطے ہم کو نہیں سنتی دنیا
ہم نے دربار میں دیکھا، جو سنا، کہتے ہیں

OO

خاک ہو جائیں گے سارے خواب، مستی ایک دن
شاخ و گل، غنچہ، نہ ہو گی گھر گرہستی ایک دن

وقت رہتے توڑ ڈالو آرزوؤں کے صنم
کس طرف لے جائے جانے بت پرستی ایک دن

معجزہ ہے اپنی خودداری بچا لینا یہاں
پر، بنا دیتی ہے شیطاں خود پرستی ایک دن

وائے مسجودِ ملائک سر جھکائے ہے کھڑا
کیا خبر تھی دیکھنا ہو گی یہ پستی ایک دن

داغ دھو جاتی سبھی جو سینۂ پر سوز کے
کاش ہم پر بھی کبھی وہ مے برستی ایک دن

کیا خبر تھی جس کی خاطر ہیں سجائے دو جہاں
اِس قدر ہو جائے گی وہ جان سستی ایک دن

راکھ ہو جائیں گے یہ ایوں تمھارے ذوالفقار
شعلہ زن ہو جائے گی ویران بستی ایک دن

OO

کب تلک قرض یہ اُٹھانا ہے
خاک ہوں خاک ہی ٹھکانا ہے

منقسم صبح شام ہوتا ہوں
رنگ وحدت کا بھی دکھانا ہے

ندرتِ غم لیے میں پھرتا ہوں
کوئی منظر نیا سجانا ہے

راہ تکتی رہیں گی یہ آنکھیں
اُس نے رستے سے لوٹ جانا ہے

تذکرہ ہے پڑوس میں، اَب پھر
اک دیوانے کا گھر جلانا ہے

اے فلک تجھ سے دوستی کیسی
تجھ کو بس سائباں بنانا ہے

تلخیو آؤ! پھر گلے مل لیں
تم سے رشتہ بہت پرانا ہے

OO

تیرے شعروں میں کیوں سکتے رہتے ہیں
لفظ معانی سے ہی لڑتے رہتے ہیں

ملنا ملانا کب کا ہم نے چھوڑ دیا
باہر جانے سے اَب ڈرتے رہتے ہیں

دے جاتے ہیں لوگ مبارک بادیں، پر
اندر اندر سارے جلتے رہتے ہیں

رب کی خاطر کون اُٹھاتا ہے صدمے
اپنے لیے تو سب ہی مرتے رہتے ہیں

کیا جانے کب اُن کی باری آ جائے
رونے والوں پر جو ہنستے رہتے ہیں

نیند نہیں آتی ہے لیکن گھر کے لوگ
کہتے ہیں ہم نیند میں بکتے رہتے ہیں

چاروں جانب شور مچا ہے اور ہمیں
تنہائی کے سانپ ہی ڈستے رہتے ہیں

OO

کس کو معلوم تھا وہ ایسا ستمگر ہو گا
حلقۂ غیر میں یوں دست بہ خنجر ہو گا

کل جہاں پھول برستے تھے، اُسی راہ میں آج
کیا خبر تھی کہ ہر اک ہاتھ میں پتھر ہو گا

کام آئے گی سیاست نہ تعلق کوئی
حشر میں بس ترے اعمال کا دفتر ہو گا

قیس اَب کوئی نہیں، دیدہ وَرو !سوچ تو لو
کون وحشت کا زمانے میں سکندر ہو گا

ایک ہی بار فقط ایک سے ہوتا ہے پیار
اب کسی طور بھی ہم سے نہ مکرّر ہوگا

بال و پر کاٹ لیے جانے پہ کیسا ماتم
روز ہوتا رہا، ہوتا ہے، یہ اکثر ہوگا

کیا یہی دیکھنے بخشی تھی بصارت تُو نے
جو بھی رہزن ہے، زمانے میں وہ رہبر ہوگا

OO

کون کہتا ہے زمانہ تری جاگیر نہیں
بات اتنی ہے کہ تُو صاحبِ تدبیر نہیں

رات دن تیرے تصوّر میں ہوں اُلجھا رہتا
میری آنکھوں میں کسی اور کی تصویر نہیں

یوں تو رکھ آیا ہوں مہتاب پہ میں اپنے قدم
پر، سیہ دل میں مرے کوئی بھی تنویر نہیں

پھول جھڑتے تھے تکلّم سے ترے، محفل میں
کیوں تری بات میں پہلی سی وہ تاثیر نہیں

جوڑ رکھا تھا تجھے اصل سے تیرے، جس نے
اَب ترے پاؤں میں اُس خاک کی زنجیر نہیں

تھام لیں ہاتھ ،بتا کس کا بھٹکنے والے
کوئی رہبر نہیں، منزل نہیں،رہگیر نہیں

اب زمانے میں ہیں رشتے بھی سبھی مطلب کے
بھائی بھائی نہیں، ہمشیر بھی ہمشیر نہیں

OO

اِس شہر میں ہر شخص سے انجان ہیں آنکھیں
یا بیچ خرابوں کے پریشان ہیں آنکھیں

ممکن ہے کہ دو چار نہ ہو پائیں کبھی پھر
کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ مہمان ہیں آنکھیں

ہر شاخ سے ٹپکا جو لہو اِن میں بسا ہے
پژمردہ گلستاں کی گلدان ہیں آنکھیں

صحرا کی تمازت سے حذر کیسے کریں گی
ہر دشت و بیاباں کی یہ سلطان ہیں آنکھیں

چہروں پہ نئے چہرے لیے پھرتے ہیں سب لوگ
حیرت کی نہیں بات جو حیران ہیں آنکھیں

بے ذوق نگاہی کو چھپاؤں بھی تو کیسے
تفہیم کی، ادراک کی، پہچان ہیں آنکھیں

اک روز جھرونکوں سے نظر مجھ پہ پڑی تھی
اُس روز سے، اُن آنکھوں پہ قربان ہیں آنکھیں

○○

دل میں پہلے سا وہ اُبال کہاں
وہ لڑکپن کے ماہ و سال کہاں

خود اُبھرتے تھے گوہرِ یکتا
اب سخن میں مگر اُچھال کہاں

لے گیا کِذب تیرے چہرے سے
اَب وہ رونق کہاں، جلال کہاں

حکم سے تیرے انحراف کروں
شہر میں یہ مری مجال کہاں

ناطقوں پر لٹکتے ہیں خنجر
اب لبوں پر کوئی سوال کہاں

تیشۂ عزم پاس ہو تو پھر
کوہ کن کو کوئی زوال کہاں

بد مزاجی ہے چار سُو پھیلی
شہر میں کوئی خوش خِصال کہاں

کون لے گا اے ذوالفقار اسے
لے چلے قلبِ پائمال کہاں

OO

بے لوث اداؤں کی ہَوا کیوں نہیں آتی
جو قلب سے اُٹھتی تھی صدا کیوں نہیں آتی

پیغامِ خودی حرف کی جاگیر تھا لیکن
اَشعار سے اب ویسی ندا کیوں نہیں آتی

تن پر تو سجا رکھا ہے ملبوس شہانہ
آنکھوں میں مگر تیری حیا کیوں نہیں آتی

ہر شاخ پہ تیزاب کی بارش ہے مسلسل
ہو زیست کا ساماں جو صبا، کیوں نہیں آتی

معتوب ہوں، رنجور ہوں، محصورِ بلا ہوں
کیوں، شہر میں جینے کی ادا کیوں نہیں آتی

جو شہر پہ ظلمات کے ہالے کو مٹا دے
اک شمع لیے ایسی فضا کیوں نہیں آتی

ہم سینچتے آئے ہیں اِسے خونِ جگر سے
اِس دشت کے ذرّوں میں وفا کیوں نہیں آتی

مظلوم کی آہوں کی رسائی ہو فلک تک
ہونٹوں پہ ترے اب یہ دعا کیوں نہیں آتی

OO

چلا گیا تھا پلٹ کر مگر نہیں آیا
مرے نصیب کا پتھر بھی گھر نہیں آیا

نجانے کیسا لگایا ہے پیڑ آنگن میں
وفا و پیار کا جس پر ثمر نہیں آیا

سرِ غرور ابھی تک جھکا نہیں یارو!
ابھی ہماری دعا میں اثر نہیں آیا

بڑی عجیب ہے دنیا رُلا کے ہنستی ہے
ہنسانے کا کوئی لیکن ہنر نہیں آیا

گھروں کو لوٹ ہی آتے سبھی پرندے، پر
ہمارے شہر کی جانب شجر نہیں آیا

کہاں رہا وہ سلامت کسی کے شانوں پر
تمھارے پاؤں میں کوئی جو سر نہیں آیا

جو میری تیرہ شبی میں مرا سہارا ہو
کبھی وہ چاند مرے بام پر نہیں آیا

بدل ہی جائے گا بگڑا ہوا جہاں اک دن
ابھی رُکو کہ ابھی کوزہ گر نہیں آیا

OO

سانپ شاخوں میں تھے در آئے بہت
کام آتے کس طرح سائے بہت

کوئی ساحل پر نہ تھا، اُس نے مگر
غرق ہوتے ہاتھ لہرائے بہت

ایک دیوانہ جو آیا شہر میں
سب نے پتھر اُس پہ برسائے بہت

جان کر، تعبیر سب کی خاک ہے
زندگی نے خواب دکھلائے بہت

چاک دامانی گئی پھر بھی نہیں
اُن کے ہاتھوں زخم سلوائے بہت

ڈھل نہیں پائے کدورت کے نشاں
آبِ زمزم میں نہا آئے بہت

دور رہ کر بھی سسکتے ہی رہے
اور ہم مل کر بھی پچھتائے بہت

گتھیاں اپنی نہ سلجھیں ذوالفقار
مسئلے اوروں کے اُلجھائے بہت

OO

شعور و فکر سے آگے نکل بھی سکتا ہے
مرا جنون ہواؤں پہ چل بھی سکتا ہے

مرے گماں پہ اُٹھاؤ نہ اُنگلیاں صاحب
گماں یقیں میں یقیناً بدل بھی سکتا ہے

پہاڑ اپنی قدامت پہ یوں نہ اِترائیں
اُبھر گیا کوئی ذرہ، نگل بھی سکتا ہے

مرے لبوں پہ جمی برف سوچ کر چھونا
تمھارے جسم کا آہن پگھل بھی سکتا ہے

کوئی عصا بھی نہیں اور پھر اکیلا تُو
امیرِ شہر کا اژدر نگل بھی سکتا ہے

ہمارے ساتھ ہے چلنا تو زادِ رہ لے لو
کٹھن سے موڑ ہیں پاؤں پھسل بھی سکتا ہے

کر اپنے سائے سے راز و نیاز کی باتیں
بہت اُداس ہے لیکن بہل بھی سکتا ہے

کرو نہ ضد کہ کسی شہر کی طرف جاؤں
مرے عزیز یہ دل ہے مچل بھی سکتا ہے

بس اِک نظر جو کرم کی ہو ذوالفقار اِدھر
قدم بہک جو گیا ہے سنبھل بھی سکتا ہے

OO

ہر سر ہے جھکا پیشِ بتاں، دیکھ رہا ہوں
اک کرتبِ نا کردہ بیاں دیکھ رہا ہوں

ہر سمت ہیں شعلوں کے چٹخنے کی صدائیں
جلتا ہوا ہر ایک مکاں دیکھ رہا ہوں

آ دیکھ! مری آنکھ کی پتلی میں کبھی دیکھ
جو رازِ جہاں کنزِ نہاں دیکھ رہا ہوں

جو نقطۂ سرکل نظر آیا نہ کسی کو
وہ نور فشاں ایک نشاں دیکھ رہا ہوں

بدلے میں غموں کے جہاں مل جائے مسرت
نادان ہوں، اک ایسی دکاں دیکھ رہا ہوں

بے خوف اُتر جاتا ہے وہ آگ میں یکسر
میں ہوں کہ ابھی سود و زیاں دیکھ رہا ہوں

باقی ہے زمانے میں ابھی شمر مزاجی
سر کتنے سرِ نوکِ سناں دیکھ رہا ہوں

اُمّید کا تارہ بھی سرِ وقت چڑھے گا
میں تیرہ شبی محوِ فغاں، دیکھ رہا ہوں

اِک آن میں جل جائیں گے ایوان تمھارے
اُٹھتا ہوا ہر دل سے دھواں دیکھ رہا ہوں

OO

خاک سے خاک ملاؤں تو ملاؤں کیسے
دشتِ وحشت میں اُتر جاؤں تو جاؤں کیسے

کوئی جادہ ہے نہ منزل نہ نشانی کوئی
بے خبر پاؤں بڑھاؤں تو بڑھاؤں کیسے

رقص کرتی ہے ترے خون میں ریاکاری جو
دست و پا اُس پہ چلاؤں تو چلاؤں کیسے

خاک میں میری دہکتے ہوئے انگاروں کو
سرد آہوں سے بجھاؤں تو بجھاؤں کیسے

آبیاری کے لیے کوئی میسر ہے بھی؟
دشت میں پیڑ لگاؤں تو لگاؤں کیسے

آنکھ لگنے ہی نہیں دیتا یہ غوغا اک پل
خواب پلکوں پہ سجاؤں تو سجاؤں کیسے

زخم دوزی کی دکاں پر ہے دریدہ کاری
جسم کے چاک سلاؤں تو سلاؤں کیسے

تیرے کانوں میں ہمہ وقت چڑیلیں رقصاں
بھیروی راگ سناؤں تو سناؤں کیسے

چشم کوروں کا ہے اطراف پہ ہالہ صاحب
دیدہ ور کوئی بلاؤں تو بلاؤں کیسے

OO

ہمارا مسئلہ کچھ ایسا مسئلہ بھی نہیں
عجب تو یہ ہے کہیں اِس کا تذکرہ بھی نہیں

میں روز ڈھوتا ہوں اپنی ہی لاش صدیوں سے
مجھے خبر ہے کہ اِس کا کوئی صلہ بھی نہیں

اُسے پکار لیا جائے گا دمِ رُخصت
اگر نہ آئے تو اُس سے کوئی گلہ بھی نہیں

تمھاری آنکھ سے پینے سے بچتا رہتا ہوں
مگر یہ کیسے کہوں اِس میں ذائقہ بھی نہیں

ہر ایک بار فقط مجھ کو ہارنا ہو گا؟
ہمارے کھیل کا کچھ ایسا قاعدہ بھی نہیں

وصال سوچنا اور ہجر کاٹنا شب بھر
پرانا وصف ہے تازہ یہ سلسلہ بھی نہیں

یہ جس مقام پہ تم نے اکیلا چھوڑا ہے
ہم ایسوں کے لیے مشکل یہ مرحلہ بھی نہیں

ابھی تو پاس تھا میرے، یہیں وہ بیٹھا تھا
یقین بھی نہیں آتا، یہ واہمہ بھی نہیں

برہنگی ہی بھلی ہے، اُتار لے اِس کو
لباسِ خاک کا اَب مجھ کو فائدہ بھی نہیں

OO

دھوپ کی بارش ہے، سَر کو ڈھانپنے دیتا نہیں
اور درختوں کو وہ سائے بھی گھنے دیتا نہیں

نطق پر پہرا لگا ہے، بولنے دیتا نہیں
اور پھر چُپ بھی مجھے وہ اوڑھنے دیتا نہیں

پھر نکل آیا ہے موسم زخم ریزی کے لیے
درد کی سوغات رُخ سے پَوچھنے دیتا نہیں

وہ بلاتا ہے مجھے باہوں میں اپنی رات دن
ذائقہ تیرا تجھے پر چھوڑنے دیتا نہیں

چاہتا ہے دل پلٹ جاؤں خرابوں کی طرف
قافلہ خوشبو کا تیری لوٹنے دیتا نہیں

اُس نے اینٹیں جوڑ کر دیوار کر لی ہے کھڑی
اپنی جانب جھانکنے تک سوچنے دیتا نہیں

وقت کا ہر اک حوالہ اُس کا جانب دار ہے
قبر بھی میری مجھے وہ کھودنے دیتا نہیں

ڈال کر خود ہی قفس میں، در پہ پہرے دار ہے
غیر کے ہاتھوں پروں کو نوچنے دیتا نہیں

وقت نے مسحور کر رکھے ہیں سارے قمقمے
تیرگی کی آنکھ مجھ کو پھوڑنے دیتا نہیں

OO

دو قدم ساتھ کوئی اپنا پرایا نہ گیا
پھر بھی مشکل کو کبھی سر پہ بٹھایا نہ گیا

دل کے ریشے بھی ترے ہاتھ پہ رکھے لیکن
تیرے ہاتھوں سے کوئی چاک سِلایا نہ گیا

بزم سے اُن کی نکل آئے مگر عجلت میں
اپنی الفت کا جنازہ تھا، اُٹھایا نہ گیا

جانے کیوں لب پہ مرے آ کے ٹھہر جاتا ہے
ایک قصہ جو سرِ بزم سنایا نہ گیا

دے کے دستک وہ مرے دل پہ کہاں ہے غائب
ایک مدت سے کوئی اور بھی آیا نہ گیا

دیکھ دستار نہیں سر پہ تو پھر کیسا سر
جسم پر ہوتے ہوئے بھی جو بچایا نہ گیا

دل کی دھڑکن ہے سرِ بزم سُنائی دیتی
چپ کا وعدہ تھا مگر دل سے نبھایا نہ گیا

کاٹ آیا تھا طنابیں میں سبھی نفرت کی
خیمۂ بخل مگر جڑ سے مٹایا نہ گیا

ایک چلّو بھی نہیں آب کا لایا کوئی
میرا گھر جلتا رہا اور بجھایا نہ گیا

OO

DASHT-E-WAHSHAT

by : Syed Zulfiqar Ali Shah
(Zulfiqar Naqvi)

انسانی ذہن میں خیالات کا خزانہ عام [illegible] سے کچھ ہی خیالات کو زندگی نصیب ہوتی ہے۔ باقی خیالات ذہن کے مردہ [illegible] محفوظ رہتے ہیں یا معدوم ہو جاتے ہیں۔

ذہن میں موجزن خیالات کی فنکارانہ ترسیل آسان عمل نہیں ہے۔ اس کے لیے بہت دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فنکار کی اظہاری اور تخیلی قوت سے ہی خیالات کی شکل اور صورت کے مدارج طے ہوتے ہیں۔ ایک پختہ فنکار معمولی یا عمومی خیالات کو بھی اپنے احساس واظہار کی توانائی سے اتنا تابندہ کر دیتا ہے کہ شعری اظہاریے میں ایک نئی کیفیت سی [illegible] جاتی ہے۔

ذوالفقار نقوی نے اپنے تخلیقی اظہار میں فکری نبوغت اور لسانی قدرت وندرت کا پورا ثبوت [illegible]۔ ان کی لفظیا[illegible] اور تراکیب میں تازہ کاری اور تنوع ہے۔ صحرا، دریا، اشک، آگ، سرِ دشتِ جنوں، وفورِ وحش[illegible]، اور دیگر تصا[illegible] تراکیب ولفظیات نے ان کی شعری رہ گزر کو اوروں سے الگ کر دیا ہے۔ ان کی شاعری میں [illegible] عناصر نے بھی ایک کشش کی کیفیت خلق کی ہے:

خشک روٹی تو دے نہیں سکتے — تر نوالوں کی بات کرتے ہو
تمھارے شہر میں کشکول خالی — یہاں اتنی گرانی ہو گئی ہے

نقوی کی شاعری انسانی معاملات ومتعلقات، معاشرتی رویوں اور زوال پذیر ثقافتی اقدار کا پُر اثر بیانیہ ہے۔ داخلی اور خارجی ادراکات کی عمدہ عکاسی ہے۔ عصری حسیت سے معموران کی شاعری میں لفظوں سے ماورا ابھی بہت کچھ ہے۔ ان کے شعروں سے حیات وکائنات کی تفہیم کے عصری زاویے سامنے آتے ہیں اور احساس واظہار کا ایک نیا در سا کھلتا محسوس ہوتا ہے۔

نقوی کا جداگانہ شعری اسلوب ہے۔ ایک الگ رنگ وآہنگ ہے، ان کا اپنا الگ لہجہ ہے جو ان کے تخلیقی جنون وریاضت کا مظہر ہے۔ انھی کا ایک خوبصورت مصرع ہے "مرا جنون ہواؤں پہ چل بھی سکتا ہے"۔ نقوی کا الگ طور وطرز ہے۔ بطور ثبوت یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میرے لبوں پہ جمی برف سوچ کر چھونا — تمھارے جسم کا آہن پگھل بھی سکتا ہے
یہ تیرہ شبی راستہ دے گی نہ کسی طور — سورج کی طرف ہاتھ بڑھانا ہی پڑے گا

اس نوع کے بہت سے شعر ان کی تخلیقی زنبیل میں ہیں۔ جو ان کے شعری انفراد اور اختصاص کا اشاریہ ہیں۔ ان کے ہاں لفظیات وتراکیب کے ساتھ تخیلات اور تصورات کی اعلیٰ سطح بھی ہے جو انھیں معاصر شاعروں میں مختلف پہچان عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

حقانی القاسمی، نئی دہلی
21/جون/2021

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA